وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جولائی ۱۹۷۷ء

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

شائع کردہ

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور

چندہ سالانہ -/۱۵ — قیمت فی نسخہ ۱/۵۰

وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۲۶	ماہ جولائی ۱۹۷۷ء	شمارہ ۱۰

مشمولات

● تذکرہ و تبصرہ	جمیل الرحمٰن	صفحہ	۱
● شرک اور اقسام شرک	ڈاکٹر اسرار احمد	،،	۲۱
● دعوت الی اللہ	مولانا وصی مظہر ندوی	،،	۲۷
● حضرت عبداللہ بن عباس رض	محترمہ جمیلہ شوکت	،،	۳۱
● رسول ص کا طریق انقلاب	سید قطب شہید رح	،،	۴۲
● خطوط و آرا	مختلف اصحاب	،،	۵۵
● تقریظ و تنقید	ج-ر	،،	۶۱

★

مرتب : شیخ جمیل الرحمٰن

مقام اشاعت : ۳۶، کے - ماڈل ٹاؤن - لاہور (فون : ۳۵۲۶۱۱)

ڈاکٹر اسرار احمد (ناشر) نے بااہتمام چوہدری رشید احمد (طابع) مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح سے چھپوا کر مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی، ۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن - لاہور سے شائع کیا۔

جمیل الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

اس جہانِ آب و گل اور عالمِ اسباب و علل میں کائنات کے فاطر، خالق، مالک، مدبّر، اور عزیز و حکیم کی یہ حکمت و سُنّت کارفرما نظر آتی ہے کہ اس نے ہر کام کے لیے چند ضابطے اور اُصول مقرّر فرمائے ہوئے ہیں۔ جب کوئی مقصود حاصل کرنے کے لیے ان مقرّرہ ضوابط و اصول کے مطابق کام کیا جاتا ہے تو خاطر خواہ نتائج برآمد ہوتے ہیں — اس بات کو مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر آم کا درخت مطلوب ہو تو ان تمام شرائط کو ملحوظ رکھنا لازمی و لابدی ہے جو فطرت نے آم کے درخت کے لیے مقرّر کی ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ بیج تو کسی اور پھل کا بویا جائے اور توقّع یہ کی جائے کہ اس سے آم کا درخت نشوونما پاکر برگ و بار لائے گا۔ محض تمنّا و آرزو سے قانونِ فطرت نہیں بدل سکتا۔ آم کا بیج آم ہی کا پھل دے گا، سیب کا نہیں۔ اسی مضمون کو فارسی کے ایک مشہور شعر میں اس طرح ادا کیا گیا ہے کہ ؎

از مکافاتِ عمل غافل مشو گندم از گندم بروید جو ز جو!

اس ضمن میں یہ اہم بات بھی پیشِ نظر رکھنی ضروری ہے کہ آم کا درخت وہی درخت کہلائے گا جو اپنی اصل سے لے کر اپنے ثمر تک آم ہی کا درخت ہو۔ یہ ممکن نہیں کہ جڑ تو آم کی ہو لیکن اس کا پھل سیب کا ہو یا اس کا تنا اور پتّے کسی دوسرے درخت کے مانند ہوں۔

فطرت کا یہی اصول کسی ملک کی سیاسی و معاشرتی و معاشی صورتِ حال کی تبدیلی میں بھی کارفرما رہتا ہے۔ جس قسم کی تبدیلی مقصود ہو اس کے لیے جو طریق کار مقرّر ہے، اس کے جملہ تقاضے بہ کمال و تمام پورا کرنے سے مطلوبہ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اس دار المحن اور عالمِ اسباب و علل میں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ مقصد خیر ہے یا شرّ اور طریقِ کار پاکیزہ ہے یا مذموم — اس عالم میں نتائج سعی و جہد کا حق ادا کرنے سے برآمد ہوتے ہیں۔ اس بات کو چند مثالوں سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے :-

۱- کسی ملک میں کوئی پارٹی کمیونسٹ انقلاب برپا کرنا چاہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ پہلے طبقاتی شعور پیدا کرے۔ پھر طبقاتی تصادم کو ہوا دے، منافرت کی آگ بھڑکائے خانہ جنگی کی حوصلہ افزائی کرے، آگ اور خون کی ہولی کھیلے، جب کہیں جا کر کمیونسٹ انقلاب کی راہ ہموار ہوگی۔ اگر ان طریقوں کے سوا دوسرے طریقے استعمال کیے جائیں تو ہو سکتا ہے کہ کوئی جزوی تبدیلی وقوع پذیر ہو جائے۔ لیکن جس چیز کا نام "انقلاب" ہے، وہ رُونما نہیں ہو سکتا۔

۲- کسی ملک میں آمریت یا مطلق العنان ملوکیت کا تسلط ہو اور کوئی منظم پارٹی اس ملک میں جمہوری طرزِ عمل کے قیام کی دعویدار ہو کر اٹھے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ آمریت و ملوکیت کے خلاف ایک عام نفرت پیدا کرے۔ صاحبِ اقتدار کی حق و ناحق کی تمیز کے بغیر کردار کشی کرے۔ انتہائی بڑے پیمانے پر مظاہرے کرائے، جلسے جلوس ہوں، فلک شگاف نعرے لگائے جائیں، جذبات کو مشتعل کرنے والی جوشیلی تقاریر کی جائیں، سب و شتم ہو، توڑ پھوڑ ہو، قانون کی خلاف ورزی ہو اور جان و مال کی قربانیاں پیش کی جائیں۔ جب کہیں یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ آمریت یا ملوکیت کا جنازہ نکل سکے اور جمہوریت کی راہ ہموار ہو سکے۔

۳- کسی ملک میں جمہوریت بالفعل قائم ہے تو ایسے ملک میں جو مختلف پارٹیاں چند جزوی مسائل یا لیڈر شپ سے نظری یا ذاتی اختلافات کی بنا پر اپنا علیحدہ تشخص برقرار رکھتے ہوئے ملک میں "حزبِ اختلاف" کا کردار ادا کرتی ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ حزبِ اقتدار پر تلخ و تند تنقیدیں ہوں، اس کے معائب کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جائے۔ اس کے محاسن سے نہ صرف یہ کہ صرفِ نظر کیا جائے بلکہ انہیں بھی کسی نہ کسی تاویل سے معائب کی فہرست میں ٹانک دیا جائے۔ اپنی پارٹی کے منشور کے ذریعے قوم کو خوش حالی، فلاحی مملکت، امن و امان اور اسی نوع کے دوسرے سنہرے خواب دکھائے جائیں۔ عام انتخابات کے موقع پر پروپیگنڈے کی تکنیک سے مسحور کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے اور اقتدار کے حصول کے لیے ہر ممکن طریقہ و حربہ استعمال کیا جائے اور اس میں "اخلاقیات" کو یا تو بالکل اہمیت ہی نہ دی جائے اور اگر دی جائے تو اس حد تک جو اپنے مقصد کے حصول میں مفید مطلب ہو — اس کے برعکس

تقریباً یہی وطیرہ اور طرزِ عمل حزبِ اقتدار اختیار کرتی ہے۔ بلکہ وہ دو قدم آگے بڑھ کر ریاست کے ذرائع ابلاغ اور ریاست کے کارکنان کو اپنی پارٹی کے حق میں استعمال کرنے کی خیانت کی مرتکب ہوتی ہے۔ حزبِ اختلاف کی کردار کشی اور مخالفین پر ظلم و تعدی سے کوئی دریغ نہیں کرتی اور وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے جس کے ذریعے وہ اقتدار اپنے قبضے میں رکھنے کیلئے ضروری سمجھتی ہے۔ وہ ریاست کے کارپردازوں سے جعل سازی کرانے میں بھی باک محسوس نہیں کرتی اور اس کو اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا کہ وہ ان کارکنان کو اس برائی میں ملوث کر کے کتنے بھیانک قومی جرم کا ارتکاب کر رہی ہے — پھر برسرِ اقتدار پارٹی اپنے ان کاموں کو جن کو امورِ مملکت کے طور پر بر حکومت کو سرانجام دینا لازمی ہوتا ہے، اپنی پارٹی کے "خاص کارنامے" بنا کر پیش کرتی ہے اور اس کا سارا زور ملک و قوم کو یہ باور کرانے پر صرف ہوتا ہے کہ ان کی پارٹی اور ملک کا قیام و بقا اور ترقی و استحکام گویا لازم و ملزوم ہیں۔

دنیوی نقطۂ نظر سے سیاسی تبدیلی کے لیے مندرجہ بالا طریق ہائے کار دنیا میں فی الوقت رائج ہیں جن کا ہر صاحبِ عقلِ سلیم از خود ادراک کر سکتا ہے۔ مقامی حالات کی وجہ سے جزئیات میں فرق واقع ہو سکتا ہے لیکن اصلِ اصول کے طور پر اسی منہجِ عمل کو سیاسی تبدیلیوں کا محور و مرکز کا مقام حاصل ہے۔

ان طریق ہائے کار پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر مقصد کے لیے ایک مخصوص طریق کار ہوتا ہے اور ہر مقصد کے لیے ہر طریق کار مفید نہیں ہوتا — مزید براں ان مخصوص طریق ہائے کار پر غور و فکر سے بہ ادنیٰ تأمل یہ حقیقت بھی عیاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ ان میں سے کسی طریق کار میں بھی خدا ترسی، آخرت اندیشی اور اخلاق کی پابندی یا تو سرے سے موجود ہی نظر نہیں آئے گی اور اگر کسی خاص پارٹی کے پیشِ نظر یہ امور ہوں بھی تو ان کی حیثیت آٹے میں نمک سے زیادہ نہیں ہوگی۔

اِن طریق ہائے کار سے اگر کوئی تبدیلی رُونما ہوتی بھی ہے تو قطعی طور پر جزوی اور خالصتاً دنیوی مفادات سے متعلق ہوتی ہے۔ اس کا کوئی تعلق انسانی اخلاقیات اور بالخصوص دینِ اسلام اور اُس عالمِ آخرت سے نہیں ہوتا جس پر ایمان و ایقان ہر مسلمان کے مسلمان ہونے کے لیے ضروری اور لازمی و لابدی ہے۔ جہاں انسان کو اپنی

دنیوی زندگی کے اعمال کا لازماً بھرپور بدلہ ملے گا، جس میں خدا کے فرماں برداروں کے لیے جزا ہے اور ابدی راحت و آرام ہے نیز طاغیوں اور باغیوں کے لیے سزا ہے اور ہمیش ہمیش کے لیے عقوبت و عذاب ہے۔ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ۝

مثال کے طور پر روس یا جن ملکوں میں بالشویک انقلابات آئے وہاں نظامِ معیشت میں بظاہر ایک خوش گوار تبدیلی ہوئی۔ لیکن اس کے نتیجے میں بے شمار مفاسد بھی پیدا ہوئے، حریتِ فکر، آزادیٔ عمل مفقود ہوئی اور پورا ملک ایک جیل خانہ بن کر رہ گیا۔ انقلابِ فرانس کے بعد ملوکیت یا آمریت کے خلاف جہاں جہاں انقلابات آئے وہاں طرزِ حکومت کے ڈھانچے میں بظاہر ایک خوش آئند تبدیلی آئی، لیکن وہاں بھی لاتعداد خرابیوں نے جنم لیا۔ خاص طور پر اخلاقیات کا دیوالہ نکل گیا، ہر اخلاقی قدر پامال ہوئی، انفرادیت نے اجتماعیت پر غلبہ حاصل کیا اور ایک بادشاہ یا آمر کی بجائے ایک پارٹی کو سِ لمن الملک بجانے لگی۔

گویا ایسی ہر تبدیلی بظاہر خوش آئند نظر آئی لیکن حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے یہ تبدیلی دین و مذہب اور انسانی اخلاقیات کے لیے زہرِ ہلاہل ثابت ہوئی۔ انسان روز بروز خدا سے غافل اور آخرت کے محاسبے سے محجوب ہوتا چلا گیا

واقعہ یہ ہے کہ آج پوری انسانیت انسان کے بنائے ہوئے نظامِ ہائے زندگی اور انقلاب کے طریق کار کی ہلاکت خیزیوں کی وجہ سے انتہائی کرب میں مبتلا ہے اور پوری انسانیت مادہ پرستی اور دنیوی عیش و آرام طلبی کے طلسم میں ایسی گرفتار ہے کہ اس کو اس خسرانِ ابدی کی پروا ہی نہیں جس کی وعید دی گئی ہے کہ: وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ آج پوری دنیا ایک ایسی پیاس میں مبتلا ہے جسے "تشنہ" کہا جاتا ہے کہ پانی پیے جاؤ لیکن سیرابی کی نعمت سے محرومی ہے گویا ؎

بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی!

اس وقت الحاد اور زندیقیت کے اندھیروں اور غبار نے پورے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، اور: ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کی کیفیت بالفعل

قائم ہے۔

یہ بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو افراط و تفریط کے ان دھکوں اور ہلاکت خیزیوں سے بچنے کی ہدایت نہ دی ہو اور ایک صالح انقلاب کے منہاج کی طرف اس کی رہنمائی نہ فرمائی ہو۔ وہ اللہ جو رب العالمین ہے، جس کی ربوبیتِ کاملہ اس کائنات کے ہر ذرّے سے ہویدا و مشہود ہے۔ اس نے جہاں انسان کی حیوانی ضروریات کا بہ کمال و تمام اہتمام فرمایا ہے وہاں اس کی رُوحانی و اخلاقی ربوبیّت و تربیّت کا بھی کامل انتظام فرمایا ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے دونوں دائروں پر محیط ہے۔ چنانچہ پہلے انسانی جوڑے کا جب کُرّۂ ارض پر بحیثیت خلیفۃ اللہ ہبوط ہوا تو کائنات کے خالق و مالک اور رب نے اس پر یہ حقیقت نفس الامری واضح فرما دی کہ :

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (بقرہ: ۳۸)

ہم نے کہا اُترو یہاں سے سب، تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو اُن کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (نہ دنیا میں خوف سے سابقہ پیش آئے گا نہ آخرت میں حُزن سے)

چنانچہ ہمیں قرآن مجید کے ذریعے خبر دی گئی کہ :

إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ ۖ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝

(سورۂ رعد: ۷)

(اے نبیؐ) آپ تو بس ایک آگاہ کر دینے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ۝ (فاطر: ۲۴)

(اے نبیؐ) ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ اور کوئی امت ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی مُتنبّہ کرنے والا نہ آیا ہو!

ہادیانِ برحق کے گُل سرسبد ہیں ہمارے رسول خاتم النّبیّینؐ سیّد المرسلین محمد الامین

صلی اللہ علیہ وسلم۔ آنحضور جن کو مالک ارض وسما نے پوری نوعِ انسانی کے لیے تا قیام قیامت ہادی، رہنما اور بشیر و نذیر بنا کر مبعوث فرمایا ہے: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ط جن کا دورِ رسالت قیامت تک جاری رہنے والا ہے جن کو اللہ رب العزت نے قرآن مجید، فرقانِ حمید کی صورت میں انسانوں کی رہنمائی کے لیے وہ نسخۂ کیمیا عطا فرمایا جو تا قیامِ قیامت ہر تحریف سے محفوظ رہے گا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ اُس ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فِدَاہُ اَبِیْ وَاُمِّیْ نے بھی آج سے چودہ سو سال قبل جزیرہ نمائے عرب میں ایک صالح انقلاب برپا فرمایا تھا جو تاثیر و نفوذ کے لحاظ سے آفاقی و عالمگیر تھا اور جس نے انسانی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا تھا جس میں صالح انقلاب بالفعل اور محسوس و مشہود واقع نہ ہوا ہو ـــــ لاتعداد معبودانِ باطل (دیوی اور دیوتاؤں) کے پجاری عباد الرحمٰن اور خدائے واحد کے پرستار بن گئے۔ جو لوگ آبرو باختہ اور مذائم اخلاق کے حامل تھے وہ نہ صرف خود معلمِ اخلاق بن گئے بلکہ ایسے متقی و ابرار بن گئے، جن کے تقویٰ و بِر کی شہادت خود عالم الغیب والشہادہ کی ہستی جلّ جلالہٗ عمّ نوالہٗ نے دی۔ زنا شراب اور قمار بازی جن کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، وہ ایسے زاہد و عابد بن گئے کہ فرشتے بھی اُن کے زہد و عبادت پر رشک کرنے لگے۔ جو قبائلی تعصب، عصبیت اور منافرت کے خوگر تھے، اس انقلاب کی وجہ سے آپس میں بھائی بھائی (اخوان) بن گئے اور اللہ تعالیٰ سبحانہٗ نے انہیں "بنیانِ مرصوص" کے معزز لقب سے نوازا۔ جو لٹیرے اور ڈاکو، اور خائن تھے وہ عزتوں کے محافظ، مظلوموں کے ماویٰ و ملجا اور خلقِ خدا کے لیے امین بن گئے۔ وہ جو زور و دروغ کے عادی اور لاابالی خو کے حامل تھے، راستباز و راست گو اور راست کردار اور متین و حلیم بن گئے۔ جو علم سے نابلد، انتشار کے خوگر، آئینِ جہانبانی سے ناآشنا تھے وہ علم و حکمت کا منبع اخوت کے علم بردار اور کشور کشا بن گئے۔ عرب کے شتر بانوں کے ہاتھوں میں جہانبانی کی عنان آ گئی اور عملاً ایک ایسا معاشرہ قائم و نافذ ہوا کہ جس سے اعلیٰ و ارفع معاشرہ اس نیلگوں فلک نے کبھی نہ دیکھا تھا اور سینۂ گیتی پر کبھی قائم ہوا تھا۔ بقولِ شاعر ؎

تھے نہ جو خود راہ پر دنیا کے رہبر بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

اور یہ صالح انقلاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کل ۲۳ برس میں برپا کر دکھایا تھا اور وہ بھی خرقِ عادت یا معجزات[1] کے ذریعے نہیں بلکہ دعوت الی اللہ کے ضمن میں مخالفت، استہزا، طنز و تعریض، جور و ستم، ظلم و تعدّی، کش مکش و تصادم کے تمام مراحل سے اس طرح گزر کر جس طرح ایک صالح اور اصولی و انقلابی دعوت کو گزرنا چاہیئے، قائم و نافذ فرمایا تھا۔ کسی کٹھن سے کٹھن مرحلے پر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں فرمایا جو اللہ کے نبی اور رسول شایانِ شان نہ ہو اور جس کی راہنمائی وحی کے ذریعہ نہ کی گئی ہو۔

قرآن مجید و فرقانِ حمید نے اسلامی انقلاب اور اقامت و اظہارِ دین کے لیے کون سی راہ معیّن فرمائی ہے، جس پر گامزن ہو کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کا فرضِ منصبی انجام دیا تھا، اور سرورِ عالم اور محبوبِ خدا نے اسلامی انقلاب کے لیے اپنے اُسوۂ حسنہ اور سیرتِ مطہرہ سے کون سے نشاناتِ راہ متعیّن فرمائے ہیں وہ سواء السّبیل کون سی ہے جس پر عمل پیرا ہونے والوں کو یہ خوشخبری دی گئی ہے کہ انہیں آخرت میں اللہ کی رضا اور اس دنیا میں نصرت اور عُلو سے نوازا جائے گا۔ بفحوائے آیات قرآنی: رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ اور نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ اور وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔

اس منہاج علی النبوّۃ علی صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کی وضاحت کے لیے ماہنامہ 'میثاق' کے اپریل ۱۹۷۷ء کے شمارے میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا "انقلابِ نبوی کا اساسی منہاج" کے عنوان سے ایک اہم مقالہ، اور جون ۱۹۷۷ء کے شمارے میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہٗ کے معرکۃ الآرا مضمون "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" کا ایک طویل اقتباس شائع کیا جا چکا ہے۔ نیز زیرِ نظر شمارے میں سیّد قطب شہیدؒ کے ایک فکر انگیز مقالے "رسولؐ کا طریقِ انقلاب" کا اردو ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے۔ راقم الحروف قارئینِ 'میثاق' کو دعوت دیتا ہے کہ وہ ان تینوں مقالوں کا بالاستیعاب مطالعہ فرمائیں۔ توقع ہے کہ اس طرح وہ 'تنظیم اسلامی' کے موقف کو اچھی

[1] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حسّی معجزات اور غیبی امداد و نصرت بھی عطا ہوئی تھی۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ حضورؐ کی جدّوجہد کا اصل رُخ وہی تھا جو اقامتِ دین کی ناگزیر شرائط میں داخل ہے۔

طرح سمجھ سکیں گے۔

جنوری ۱۹۷۷ء میں حزبِ اقتدار کی طرف سے ملک میں قومی و صوبائی اسمبلیوں کے انعقاد کا اعلان ہوا تھا۔ اس اعلان کے فوراً بعد ملک میں احزابِ اختلاف نے اپنا اپنا علیحدہ جداگانہ تشخص برقرار رکھتے ہوئے "قومی متحدہ محاذ" بنایا اور ملک میں انتخابات کی گہما گہمی شروع ہوگئی۔ لیکن قومی اسمبلی کے انتخابات میں جو دھاندلیاں ہوئیں اس کے پیشِ نظر متحدہ محاذ نے انتخاب کے نتیجے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ دھاندلیاں اظہر من الشمس ہیں۔ اب تو خود الیکشن کمیشن اور حکومت ان کا اعتراف کر چکی ہے ان دھاندلیوں کے خلاف ملک بھر میں ایک عوامی ایجی ٹیشن شروع ہوا۔ جس کے متعلق ماہِ مئی ۱۹۷۷ء میں 'میثاق' کے صفحات میں عرض کیا گیا تھا کہ:

> اس عوامی ایجی ٹیشن کے دو پہلو دل خوش کن بھی ہیں یعنی ایک یہ کہ اس میں عوام کو اُبھارنے اور قربانی پر آمادہ کرنے والا اصل جذبہ مذہبی تھا۔ جس سے تحریکِ پاکستان کا سا جوش و خروش پھر تازہ ہوگیا اور ایک مرتبہ پھر یہ واضح ہو گیا کہ پاکستان میں راسخ العقیدہ اسلام کتنی گہری جڑیں رکھتا ہے اور علماء کو کس قدر اثر و نفوذ حاصل ہے، اور دوسرے یہ کہ بحمداللہ پاکستان میں بسنے والے بالکل مُردہ نہیں بلکہ: ع
>
> ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

اس عوامی ایجی ٹیشن اور قربانیوں کا ایک فوری اور انتہائی مبارک نتیجہ تو یہ نکلا کہ تقریباً تیس سال بعد اس ملک میں جو اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کے لیے وجود میں آیا تھا۔ شراب حرام قرار دی گئی۔ قمار بازی پر پابندی عاید ہوئی۔ ملک بھر میں تمام نائٹ کلب جو عریانی و فحاشی کے شیطانی اڈے تھے بند کر دیئے گئے ــــ دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ انتخاب میں نام نہاد کامیابی کی مدّعی پارٹی کو عوامی احتجاج کے آگے سپر ڈالنی پڑی اور وہ دوبارہ قومی اسمبلی نیز صوبائی اسمبلیوں کے انتخاب کے لیے تیار ہوگئی۔ اس سلسلہ میں

قومی متحدہ محاذ اور حکومت کے مابین ابتدائی اصولوں پر اتفاق رائے ہو چکا ہے — اور تفصیلات کے سلسلہ میں ایک معاہدے کے مسوّدے پر گفت و شنید جاری ہے۔ تادمِ تحریر معاملات واضح نہیں ہوئے ہیں اور قطعی معاہدے کے سلسلے میں جو تعویق و تاخیر ہو رہی ہے اس کی وجہ سے ایک گومگو اور SUSPENCE نیز بیم و رجا کی سی کیفیت طاری ہے۔ لیکن قرائن یہ بتا رہے ہیں کہ غالباً کوئی نہ کوئی معاہدہ ہو جائے گا اور اوائل اکتوبر میں کچھ بعد دیگرے ملک میں قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات منعقد ہوں گے۔

تنظیم اسلامی نے ۷۴ء ہی میں اپنے دستورِ اساسی کی تدوین اور مارچ ۷۵ء میں اپنی تاسیس کے موقع پر الیکشن کے سلسلہ میں اپنا موقف طے کر لیا تھا، جس کا ماہ مئی ۷۷ء کے شمارے میں اعادہ کیا جا چکا ہے۔ ہمارے بعض کرم فرما جو ہم کو عزیز رکھتے ہیں اور جو ہمیں عزیز ہیں۔ اصلاح و انقلاب کے فرق کو اچھی طرح نہ سمجھنے کے باعث ہمارے موقف کے بارے میں تشویش اور چند غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں لہٰذا مناسب معلوم ہوا کہ اس معاملہ کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ غلط فہمی دور ہو۔ ہمارے نزدیک اصلاح اور انقلاب کا فرق یہ ہے کہ جیسے کسی عمارت میں تبدیلی دو طرح ہو سکتی ہے۔ ایک یہ کہ عمارت کے اساسی نقشے کو برقرار رکھ کر صرف جزوی تبدیلی کر لی جائے اور بوسیدہ حصّے کی مرمّت کر لی جائے اور عمارت پر نیا رنگ و روغن کر لیا جائے۔ یہ عمل اصلاح کہلائے گا۔ دوسرے یہ کہ اس عمارت کو ڈھا کر بالکل نئے نقشے پر عمارت کو از سرِ نو تعمیر کیا جائے، اس عمل کو انقلاب کہا جائے گا۔

جس صورتِ حال سے ملّتِ اسلامیہ پاکستان دوچار ہے وہ یہ ہے کہ صدیوں کے تنزّل و انحطاط، ڈیڑھ سو سالہ انگریز جیسی اسلام دشمن استعماری قوت کی سیاسی غلامی اور مغرب کے ملحدانہ افکار و نظریات کے ذہنی استیلا کے باعث ہمارے سوادِ اعظم کی عظیم اکثریّت بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقے کے قلوب و اذہان میں خدا، وحی، رسالت، آخرت، بعث بعد الموت، جنّت و دوزخ اور ایسے ہی غیبی اُمور کے متعلق تشکیک و ریب کے کانٹے کافی گہرے اتر چکے ہیں۔ ان اُمورِ غیبی پر دل والا ایمان و یقین مضمحل ہو چکا ہے۔ (اِلّا ماشاء اللہ) اسلام سے ہمارا تعلّق محض توارث اور ایک قومی مذہب و عقیدے (DOGMA) کی حیثیت سے باقی رہ گیا ہے۔ ہماری عظیم اکثریّت ناواقفیّت و لاعلمی کی

وجہ سے بہت سی جاہلیتِ قدیمہ (مشرکانہ مبتدعانہ اعمال وعقاید) کو دین سمجھ کر اختیار کئے ہوئے ہے اور ان عبادات کی ادائیگی سے بالکل غافل اور بے پرواہے جو دین میں فرائض کا درجہ رکھتی ہیں۔ جو اسلام وکفر کے مابین ایک مابہ الامتیاز مقام اور خط کی حیثیت رکھتی ہے۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں صرف اس پیمانے سے اس معاشرے کو ماپ لیجئے کہ نمازِ جمعہ کی ادائیگی کا جس کو باجماعت ادا کرنے کی فرضیت سے انکار کی شاید ہی کوئی مسلمان جسارت کر سکے ہمارے معاشرے میں کتنا اہتمام ہے۔ تمام مکاتیبِ فکر اور مسالک کے مابین یہ بات متفق علیہ ہے کہ جمعہ کو خطبہ کی اذان سے لے کر اور نمازِ جمعہ کے اختتام تک ہر قسم کی بیع وشریٰ حرام ہے لیکن دیکھ لیجئے کہ اس حکم پر ہماری منڈیوں اور بازاروں میں کتنا عمل ہوتا ہے ــــ رہے خواص اور تعلیم یافتہ حضرات تو ان کا سابقہ جاہلیتِ جدیدہ سے پیش ہے۔ ان میں سے کوئی ڈارون کی تھیوری کا قتیل ہے تو کوئی مارکس اور فرائڈ کے نظریات کا معتقد ہے۔ ان کے نزدیک (نعوذ باللہ) اسلام بس اساطیر الاولین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِلّا ماشاء اللہ!

اسلام کسی قومی وتسلی عقیدے (DOGMA) کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کی دعوت یہ ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً (اے ایمان والو اللہ کی فرمانبرداری میں پُورے کے پُورے داخل ہو جاؤ) یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ :- (اے بنی نوعِ انسان! اپنے اس رب کی بندگی اختیار کرو جو تمہارا خالق بھی ہے۔) گویا اسلام کی گرفت سے انسانی زندگی کا کوئی گوشہ چاہے وہ انفرادی زندگی سے متعلق ہو چاہے اجتماعی زندگی سے، آزاد نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر "اسلام" عام معنوں میں محض ایک مذہب نہیں ہے۔ بلکہ دین یعنی ایک مکمل نظامِ حیات ہے: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ لہٰذا اسلام ہر فرد کو انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعیت تک اللہ کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے :ــــ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً۔ پھر وہ اجتماعی انقلاب سے قبل افراد کو دعوت دیتا ہے کہ وہ خود بدلیں چونکہ معاشرہ اور اجتماعیت افراد کے مجموعے ہی کا تو نام ہے چنانچہ آخرت میں ہر فرد کو خود اپنے اعمال کی جوابدہی خود ہی کرنی ہوگی وَكُلُّهُمْ اٰتِیْهِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَرْدًا ط

ان حالات میں شدید ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو وقتی وہنگامی حالات اور تحزب وعصبیت سے دامن بچا کر خالص انقلابی اور داعیانہ طرزِ عمل

اختیار کرے اور ملک کے رہنے والوں کو ایک ناقابلِ تقسیم وحدت متصوّر کرکے عمارت کی از سرِ نو تعمیر کی دعوت دے اور قرآن مجید کے ذریعے تجدید ایمان، توبہ اور تجدید عہد کی داعی بن کر کھڑی ہو۔ یہ جماعت یا گروہ قرآن مجید کو اپنا ہادی و رہنما بنائے بفحوائے آیاتِ قرآنی:

(۱) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ (النساء:۱۳۶)

اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اُتاری۔

(۲) اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل:۹)

بے شک یہ قرآن اس راستے کی رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے۔ اور ان ایمان والوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں اس بات کی بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔

اسی کتابِ الٰہی کے ذریعے ایک طرف ایک ایسی علمی و فکری تحریک بپا کرنے کی سعی کرے جو قرآنِ حکیم کے مستحکم استدلال سے بدیہاتِ فطرت کو متأثر و مطمئن اور قائل کرنے والی ہو۔ ایمان و یقین کی چنگاری کو شکوک و ریب کی راکھ میں سے کُرید کر فروزاں کر سکے اور جاہلیتِ قدیمہ و جدیدہ کا آیاتِ الٰہی سے مؤثر ابطال کر سکے۔ دوسری طرف عوامی سطح پر قرآنِ حکیم کے درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم کی ایک عوامی تحریک اٹھا کر عامۃ المسلمین کے قلوب کو نورِ ایمان و یقین سے منوّر کر سکے اور ان میں عمل کے داعیہ کو بیدار کر سکے ان کا تزکیہ کر سکے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے سکے۔ اس طرح یہ جماعت کارِ رسالت کے جہاں گیر امور کی انجام دہی کی سعادت حاصل کرے گی جو اس آیتِ کریمہ میں بیان کئے گئے ہیں:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (سورہ جمعہ:۲)

وہی ہے (اللہ) جس نے اُٹھایا اُمّیوں میں ایک رسولؐ اُن ہی میں سے، جو سناتا ہے انہیں اُس (اللہ) کی آیات اور تزکیہ کرتا ہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے ان کو کتاب اور حکمت کی۔ اگرچہ وہ تھے اس سے قبل کھلی

اصلاح ہوگی تو اسی طریق کار سے ہوگی اور اسلامی انقلاب کی راہ ہموار ہوگی تو اسی نہج سے ہوگی۔ اور اسلامی نظام کا قیام و نفاذ عمل میں آئے گا تو اسی طریقے سے آئے گا۔ پھر یہ نظام کامیابی سے چل سکے گا تو صرف اور صرف اسی عمل کی کامیابی کے طفیل چل سکے گا۔ "تنظیم اسلامی" کے قیام و تاسیس کی اصل غایت یہی ہے اور وہ اسی طریق کار کو کتاب اللہ کے عین مطابق سمجھتی ہے بفحوائے آیات قرآنی :-

● وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (آل عمران)

اور چاہیے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو نیکی کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

● وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝

اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔

ہماری معلومات کے مطابق تبلیغی جماعت بھی تقریباً یہی نقطۂ نظر رکھتی ہے کہ وقتی و ہنگامی سیاست سے دامن بچا کر اپنے مخصوص طریق کار کے مطابق مسلمانوں کو دین کے معاملے میں بے عملی دور کرنے کی دعوت دے اور پہلے ان کو ان دینی فرائض کی انجام دہی کی رغبت دلائے جو ہر مسلمان کی انفرادی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، جن کی ادائیگی کے بغیر اللہ تعالیٰ کے رجسٹر میں "مسلم و مومن" کی حیثیت سے اندراج محض خام خیالی اور خوش فہمی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ عوامی تحریکوں کے عروج کے زمانے میں ایک مرحلہ وہ بھی آتا ہے، جہاں صورت یہ بن جاتی ہے کہ "جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارا دشمن ہے"۔ راقم الحروف کو ان حالات سے اس زمانے میں بھی سابقہ پیش آچکا ہے جب غیر منقسم ہندوستان میں حصولِ پاکستان کی تحریک اپنے شباب پر تھی اور راقم الحروف جماعت اسلامی کا ایک ادنیٰ خادم تھا۔ جس کا موقف یہ تھا کہ پاکستان کے حصول کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے وہ قرآن و سنت کے مطابق نہیں ہے۔ اس کے نتیجے میں اگر پاکستان قائم ہو بھی جائے تب بھی اسلامی نظام قائم ہونا امرِ محال ہے۔ چنانچہ جماعت اسلامی بحیثیت جماعت تحریک پاکستان سے غیر متعلق اور دعوت و تبلیغ میں مصروف رہی۔ اب اگر کوئی اس طرزِ عمل کو پاکستان کی مخالفت

قبول کرے تو یہ اس کے اپنے ذہنی افق کی تنگی ہوگی۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ پاکستان جس تحریک کے نتیجے میں عالمِ وجود میں آیا اور جس نے عامۃ المسلمین کی تائید حاصل کی تو اس کا اصل نعرہ یہ تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا: ۔لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ط مگر دیکھیے کہ ایمان ویقین کی دولت کی نایابی اور اسلامی طرز پر تعلیم وتربیت کے فقدان نے یہ گل کھلایا کہ تقریباً ۴۰ سال تک اسلامی نظام کا قیام ونفاذ تو رہا ایک طرف دینی واخلاقی اعتبار سے ہم من حیث القوم انتہائی دور جا پڑے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ آج دینی لحاظ سے پاکستان کے مسلمانوں کے مقابلے میں بھارت میں بسنے والے مسلمان کہیں بہتر ہیں تو یہ بات ہرگز غلط نہیں ہوگی۔ گویا یہ بات بھی تجربے سے ثابت ہوگئی کہ تقسیم سے قبل جماعتِ اسلامی نے جن اندیشوں کا اظہار کیا تھا اور جو موقف اختیار کیا تھا وہ صدفی صد درست تھا۔

تحریکِ پاکستان اپنی جگہ نہ غلط تھی نہ کفر وضلالت بلکہ برِّصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کے علیحدہ تشخص کی بقا اور عالمِ اسلام کو مغرب کی سیاسی وعسکری غلامی سے آزادی دلانے کے لیے ناگزیر تھی۔ اسی طرح جماعتِ اسلامی کا موقف بھی عین کتاب وسنّت کے مطابق تھا کہ دعوت وتبلیغ اور تبشیر وانذار کے ذریعہ مسلمانوں کو حقیقی مسلمان بنانے کی سعی وجہد کی جائے۔ پاکستان درحقیقت اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے ورنہ پاکستان کے قیام کے ظاہری اسباب عالمِ واقعہ میں موجود نہیں تھے۔ ہندو جیسی منظم قوم کی مخالفت اور برطانیہ میں لیبر پارٹی کی حکومت (جو مسلمانوں سے اور نظریۂ پاکستان سے شدید عناد رکھتی تھی) کی مخالفت کے علی الرّغم پاکستان قائم ہونا ایک معجزے سے کم نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی اس سُنّت کے مطابق کہ: لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط ؛ (تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے) ہمیں پاکستان عطا ہوا تھا۔ لیکن ہم نے نہ اس عطیہ کی قدر کی اور نہ اپنے عہد کی پاسداری کی۔ ہم نے پاکستان مانگا تھا اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کے لیے، اسلامی نظام کے قیام ونفاذ کے لیے۔ لیکن ہم کفرانِ نعمت کے مرتکب ہوئے اور ہم نے نقضِ عہد کیا۔ پاکستان کے قیام کے بعد ہر شخص اور ہر طبقہ نے (اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ) اپنا مقصود ومطلوب حصولِ دنیا بنا لیا۔ ہم نے اللہ کی کتاب کو چھوڑا، اللہ کے نبی کی سُنّت سے اعراض کیا، اللہ کی شریعت سے بغاوت کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے کرم اور اس کی نظرِ التفات سے محروم ہوگئے۔ چونکہ اسی کا فرمان یہ ہے کہ: وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِکُمْ (میرے ساتھ تمہارا جو عہد تھا اسے تم پورا کرو

تو میرا جو عہد تمہارے ساتھ تھا اُسے مَیں پورا کروں) اور یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (اے لوگو جو ایمان رکھتے ہو، تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے (اور اُس کے غیظ و غضب کو بھڑکانے والی ہے) کہ تم وہ بات کہو جو تم کرتے نہیں)

ہم نے اسلامی شریعت کے نفاذ کے لیے پاکستان مانگا تھا، لیکن شریعت کا نفاذ تو کیا، اس ملک میں اسلام کے عائلی قوانین میں رومن قانون کی پیوند کاری کی گئی اور ہم نے ٹھنڈے پیٹوں اس کو برداشت کر لیا۔ تھوڑا بہت احتجاج ہوا لیکن غیر مؤثر — قرآنِ حکیم کا فرمان ہے کہ: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ ط اور نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ: "وہ قوم فلاح نہیں پا سکتی جو اپنے معاملات عورتوں کے ہاتھوں میں دے دے" لیکن حال یہ ہے کہ آج عملاً ہماری معاشرتی زندگی کی اصل زمامِ کار عورتوں کے ہاتھ میں ہے۔ خدا اور رسولؐ کے احکام و تعلیمات کے مقابلے میں گھر والی کی فرمائشیں اور اُس کی دلجوئی ہمیں عزیز تر ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ہم نے مملکتِ پاکستان کی سربراہی بھی ایک عورت کو سونپنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور ان زور لگانے والوں میں مقدمۃ الجیش کا مقام تھا اس جماعت کا جس نے اقامتِ دین کی جدّ و جُہد کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا —— اللہ تعالیٰ رحیم و کریم اور رؤف و ودود بھی ہے۔ اس نے مختلف منذرات و تنبیہات کے ذریعے ہم کو آگاہ فرمایا تاکہ ہم خوابِ غفلت سے جاگیں اور اپنی روش کی اصلاح کر لیں۔ لیکن ہم اپنی تقصیروں پر متنبّہ اور آگاہ ہو جانے کے بجائے ایک دوسرے کو اس کا ذمّہ دار ٹھہرا کر ایک دوسرے کو مطعون کرتے رہے اور خود کو اور دوسروں کو مغالطے دیتے رہے۔ ہم نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ یہ سب کچھ ہماری شامتِ اعمال کا نتیجہ ہے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کا المیہ اور سانحۂ فاجعہ بھی ہماری آنکھیں نہ کھول سکا۔ بلکہ ہماری غفلت کی نیند اور گہری ہوتی چلی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم قعرِ مذلّت میں گرتی چلی گئی اور آج ہلاکت کے مہیب بادل ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں۔ اور آج ہم پھر اس مقام پر کھڑے ہیں کہ عذابِ الٰہی اس صورت میں مسلط ہو کہ بھائی کا خنجر بھائی کے سینے میں پیوست ہو جائے۔

مختلف اسالیب سے متعدد مواقع پر یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ پیش آتا ہے اس میں اصل ارادہ و مشیّت اللہ تعالیٰ کی کار فرما ہوتی ہے۔ اور وہ چونکہ الحکیم بھی

ہے لہٰذا اس کی مشیت حکمتِ کاملہ کے ساتھ ظہور پذیر ہوتی ہے۔ مکافات ومجازات عمل ایک طبعی وفطری نتیجہ اس عالمِ ہست وبود میں بھی نکلتا ہے۔ قوموں کا عروج وزوال، اقتدار کی منتقلی، حالات کی تبدیلی، ارضی وسماوی آفات، یہ سارے کام مشیتِ الٰہی کے مطابق انجام پاتے ہیں— اور ان تمام کاموں میں اس کی حکمتِ کاملہ کارفرما رہتی ہے۔ اس نے مسلمانوں کو "خیر امت" کا معزز لقب عطا کیا۔ امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کو اُمّتِ وسط قرار دیا۔ امت سے تمکّن و علو فی الارض کا وعدہ فرمایا تو یہ تمام اکرام وانعام مشروط ہیں جتنا اعلیٰ منصب ہوگا اتنی ہی کڑی ذمّہ داریاں ہوں گی۔ خیرِ امت بنایا تو اس لیے کہ بحیثیتِ امت ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں بفحوائے آیتِ قرآنی :-

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ (آل عمران : ۱۱۰)

تم بہترین امت ہو۔ لوگوں کی رہنمائی کے لیے مبعوث کئے گئے ہو۔ معروف کا حکم دیتے ہو منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

امتِ وسط بنایا تو اس غرض وغایت کے لیے کہ امت بنی نوع انسان کے سامنے حق کی شہادت دے بفحوائے آیتِ قرآنی :

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۗ (البقرہ : ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمھیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور تم پر گواہی دینے والا بنے۔

تمکّن فی الارض کی خوش خبری سنائی تو ساتھ ہی چند اہم ذمّہ داریاں بھی بیان فرمائیں :

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (الحج : ۴۱)

یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔ اور انجام کار کا معاملہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

علو فی الارض کا وعدہ فرمایا تو اس شرط کے ساتھ کہ مسلمان اسلام کے زبانی دعویدار نہ ہوں بلکہ اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب والے مسلم و مومن اور عمل کے لحاظ سے اسلام وایمان کی منہ بولتی تصویر ہوں : وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (اور تم ہی

غالب رہو گے۔ بشرطیکہ تم (حقیقی) مومن ہو۔ کون لوگ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حقیقی مومن اور عباد الرحمٰن قرار پائیں گے۔ ان کی صفات یوں تو قرآنِ حکیم میں جا بجا بیان ہوئی ہیں۔ لیکن ان کو وضاحت کے ساتھ سورۂ مومنون کی آیات ۱ : ۹، سورۂ فرقان کی آیات ۶۳ تا ۷۶ اور سورۂ معارج کی آیات ۲۲ تا ۳۴ کے مطالعہ سے سمجھا جا سکتا ہے۔

آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول محاسبۂ اُخروی سے نجات کی سبیل اور اس دنیا میں فلاح و صلاح، تمکّن فی الارض اور علو و اقتدار کا استحقاق اسی طرح ممکن ہے کہ ہر مسلمان ان اوصاف کو جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہیں اور جن کی تعلیم ہادیٔ برحق اور معلّم کامل جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اور جس کے پیکرِ محسوس تھے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، اپنے اندر پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے اور دوسروں میں پیدا کرنے کی دعوت دے اور اس کام میں جو مصائب و شدائد آئیں ان کو خود بھی مردانہ وار انگیز کرے اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید و نصیحت کرے۔ اس کے بغیر آخرت کا خسران تو مقدر ہے ہی، اس عالم کون و مکان اور اس اسباب و علل میں بھی فلاح و صلاح ایک امید موہوم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اسی حقیقت کو سورۂ والعصر میں بیان کیا گیا ہے کہ : وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے عام انتخابات کے اعلان کے ساتھ ملک میں جو ہما ہمی اور گہما گہمی شروع ہوئی تھی وہ ہمارے نزدیک ملک کے سیاسی حالات میں ایک خوشگوار تبدیلی کی دنیوی تدبیر تھی۔ اس کے متعلق تنظیم اسلامی کا موقف ماہ مئی ۷۷ء کے شمارے میں بیان کیا جا چکا ہے کہ "تنظیم نے بحیثیت جماعت گو اس مسئلہ پر کامل سکوت اختیار کیا تھا۔ البتہ اپنے احباب و رفقاء کو اختیار دیا تھا کہ وہ فرمانِ نبویؐ : "اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ" کی رُو سے اپنے دل کی آواز پر عمل کریں۔ نتیجۃً تنظیم کے بہت سے احباب نے انتخابی مہم میں عملی حصّہ لیا۔ حتّٰی کہ متعدد رفقاء نے متحدہ قومی محاذ کے پولنگ ایجنٹ کے طور پر بھی کام کیا۔" ہم نے یہ فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ ہمارے نزدیک الیکشن کے ذریعے اصلاح کی کوشش نہ کفر ہے نہ ضلالت بلکہ اس کا تعلّق تدابیر میں سے ایک تدبیر سے ہے۔ اسی طرح انتخاب کے بعد دھاندلیوں کے خلاف جو تحریک چلی اُس کے بارے میں عرض کیا گیا تھا کہ : اس سے زیادہ سے زیادہ جو خیر، متوقع ہو سکتا ہے

وہ یہ ہے کہ ملک میں جمہوری اقدار کو فروغ و استحکام حاصل ہو۔" یہ کام بھی قوم کے مستقبل کو بہتر بنانے میں ایک مفید کردار ادا کر سکتا ہے۔

اس وقت ہمارے معاشرے میں من حیث القوم اتنا بگاڑ پیدا ہو چکا ہے کہ زندگی کا ہر شعبہ اصلاح کا محتاج ہے۔ لہٰذا جو اشخاص، جماعتیں، انجمنیں اور ادارے اسلامی نقطۂ نظر جس اصلاحی کام میں خواہ وہ کوئی جزوی کام ہی کیوں نہ ہو، اخلاص کے ساتھ کوشاں ہیں وہ دراصل ایک ہمہ گیر اسلامی انقلاب کے بالفعل قائم کرنے ـــــ کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اُمّت کی فلاح و اصلاح کا ہر کام افادیت کا حامل ہے۔ جیسے دریا پہاڑی ندیوں، نالوں اور آبشاروں سے وجود میں آتا ہے۔ لہٰذا ہر اصلاحی کام خیر ہی کا کام ہے۔ البتہ ہر کام کی انجام دہی میں ان تعلیمات، آداب اور شرائط کو ملحوظ رکھنا لازمی و لابدّی ہے جن کی اسلام نے تلقین کی ہے۔ جس کے بغیر نہ کوئی دنیوی کامیابی متوقّع کی جا سکتی ہے اور نہ ہی آخرت میں کسی اجر و ثواب کا استحقاق قائم ہو سکتا ہے۔ خیر آئے گا تو خیر ہی کے طور طریقوں کو اپنانے سے آئے گا۔ کسی شرّ کو شرّ کے ذریعہ ہٹانے یا مٹانے کی کوشش کی گئی تو ہو سکتا ہے کہ ایک شرّ مٹے یا ہٹے تو کوئی دوسرا اس سے بھی بڑا شرّ اس کی جگہ لے لے۔ یہ محض کوئی نظری بات نہیں ہے بلکہ اس کے شواہد ہمیں اپنی تاریخ کے ہر باب میں روزِ روشن کی طرح نظر آ سکتے ہیں۔

اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی اور دنیا کے ہادی صلّی اللہ علیہ وسلّم کو خطاب فرماتے ہوئے یہ اصل اصول بیان فرمایا کہ:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝ (حٰمٓ السجدہ)	آپ بدی کو اس نیکی سے دفع کریں جو بہترین ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔

دعوت و تبلیغ اور اصلاحِ حال کے لیے قرآنِ حکیم اور اسوۂ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم میں مسلمانوں کے لیے کامل رہنمائی موجود ہے۔ اسی طریقہ پر عمل پیرا ہونے پر ہی دنیا و آخرت میں فوز و فلاح اور کامرانی و کامیابی مضمر ہے۔

اس طویل گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ 'تنظیمِ اسلامی' نے بحیثیتِ جماعت اپنے لیے جو راستہ

متعین کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک دینی، اخلاقی، سیاسی غرضیکہ ہر اعتبار سے ہمارے زوال و انحطاط کا اصل سبب دین سے دُوری ہے۔ اور دین سے دُوری کا باعث ہے قرآنِ حکیم سے بُعد اور سُنّتِ رسولؐ سے لاتعلقی۔ ہماری اکثریت اسلامی عقائد کو محض ایک موروثی عقیدہ (DOGMA) کی حیثیت سے مانتی ہے۔ لہٰذا اس ایمان و ایقان کا کوئی اثر ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی پر مرتب نہیں ہوتا اور عمل اس ایمان و یقین سے میل نہیں کھاتا۔ گویا ہماری عظیم اکثریت 'اقرار مع الانکار' کی حالت و کیفیت سے دوچار ہے۔ لہٰذا علیٰ وجہ البصیرت ہمارا موقف یہ ہے کہ منبعِ ایمان اور سرچشمۂ یقین قرآنِ حکیم کے علم و حکمت کے ذریعے اُمّتِ مسلمہ پاکستان میں تجدیدِ ایمان۔ توبہ اور تجدیدِ عہد کی ایک ہمہ گیر تحریک بپا کی جائے۔ افراد کا تلاوتِ آیات سے تزکیہ کیا جائے، اُن کو کتاب و حکمت کی تعلیم دی جائے۔ یہ طریق کار ہمارے نزدیک درحقیقت اسلامی انقلاب اور اسلامی نظام کے قیام و نفاذ اور اس کے استحکام کے لیے اساسی حیثیت کا مقام رکھتا ہے۔ جس کے بغیر ہماری قوم کی نہ دینی، اخلاقی اور عملی اصلاح ہو سکے گی اور نہ ہی حکومت اور نظام میں کوئی مؤثر و حقیقی تبدیلی رُونما ہو سکے گی۔ معاشرہ عبارت ہے افراد کے مجموعے سے۔ جو جنس مطلوب افراد ہی میں مفقود و نایاب ہو وہ آخر معاشرے میں کیسے نظر آسکے گی۔ اسلامی نظامِ حیات فضا کی پہنائیوں میں قائم نہیں ہوتا۔ اس پوری کائنات میں تو اللہ تعالیٰ کا تکوینی نظام روزِ ازل سے جاری و ساری ہے۔ بلکہ یہ نظام انسانی معاشرے پر قائم ہوتا ہے اور اسلام کے نظامِ حیات و اطاعت کو وہی معاشرہ بہ رضا و رغبت قبول کرتا، قائم کرتا اور نافذ رکھ سکتا ہے کہ جس کے افراد کی معتدبہ تعداد میں ایمان باللہ کامل توحید کے ساتھ، ایمان بالرسالت کامل جذبہ اتباع و اطاعت کے ساتھ اور ایمان بالآخرت ان جملہ تفاصیل کے ساتھ جن کی قرآن و حدیث کے ذریعے خبر دی ہے صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے، گہری جڑیں رکھتا ہو۔ جس معاشرے میں ایسے عبادالرحمٰن کی ایک مؤثر و معتدبہ تعداد فراہم ہو جائے گی، جن کا مرنا اور جینا صرف اللہ کے لیے ہو گا جن کی زندگیاں صبغۃ اللہ کی حامل ہوں گی، جن کی نظروں میں دنیا کا مال و منال، عیش و آرام، اور راحت و لذت ہیچ ہو گی۔ جن کا مقصود یہ ہو گا کہ: اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اور جن کا نصب العین صرف رضائے الٰہی اور نجاتِ اُخروی ہو گا تو اسی معاشرے سے اللہ تعالیٰ کی سنّت کے مطابق صالح قیادت اُبھرے گی اور اسلامی نظام بالفعل قائم

نافذ ہوگا اور اس کو حقیقی استحکام حاصل ہوگا۔

ہمارا یہ موقف دراصل نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اِن ارشادات سے ماخوذ ہے کہ : اَعْمَالُکُمْ عُمَّالُکُمْ (تمہارے اعمال ہی تم پر حاکم بن جاتے ہیں) اور کَمَا تَکُوْنُوْنَ کَذٰلِكَ یُؤَمَّرُ عَلَیْکُمْ (جیسے تم خود ہوگے ویسے ہی حکّام تم پر مُسلّط کر دیئے جائیں گے) لہٰذا 'تنظیمِ اسلامی' اور وہ جماعتیں اور اشخاص جو ہنگامی' وقتی' سیاسی کش مکش سے دامن بچا کر حتی المقدور اس اساسی کام کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ وہ دراصل ان جماعتوں اور حضرات کی اعانت کر رہے ہیں جو خلوصِ دل سے شریعت کی پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس مملکتِ خداداد پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کے لیے کوشاں ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ۔ اٰمِیْن یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ٥

پنجاب کے ایک قصبے کی کسی پیری مُریدی کی گدّی سے شائع ہونے والے ماہنامے کی اشاعت بابت فروری ۷۷ء میں ایک صاحبزادہ صاحب نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی اس تحریر پر کچھ گوہر افشانی فرمائی تھی جو 'میثاق' کے دسمبر ۷۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا، اور جس میں برّ صغیر ہند و پاک میں تفسیر قرآن کے مختلف سلسلوں کے جائزے کے ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے بعض وجوہ کی بنا پر مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے ساتھ اپنے ذاتی تعلّقات کے ذیل میں وصل و فصل کی داستان بھی رقم کر دی تھی ____ صاحبزادہ صاحب کی اس تحریر کے مندرجات سے قطع نظر چونکہ اس میں ایک ناسمجھ مگر مخلص عقیدت مند کا جذبۂ خلوص جھلک رہا تھا، لہٰذا مناسب یہی سمجھا گیا کہ اس کے ضمن میں صرفِ نظر اور "غضِّ بصر" ہی سے کام لیا جائے ____ لیکن صاحبزادہ صاحب نے جب، نہ صرف یہ کہ اپریل' مئی کے مشترکہ شمارے میں اپنی اس شاہکار تحریر کو مزید نمک مرچ لگا کر دوبارہ شائع کیا بلکہ اسے ایک مہم کے انداز میں 'انجمن خدّام القرآن' اور 'تنظیمِ اسلامی' کے اکثر وابستگان اور 'میثاق' کے بیشتر خریدار حضرات کو ارسال کیا۔ تب احساس ہوا کہ اس کی پُشت پر صرف ایک معصوم عقیدت ہی کار فرما نہیں ہے بلکہ معاملہ کچھ اور ہے ____ صاحبزادہ صاحب کی اس تحریر کے 'بدء' پر بھی بعض احباب و رُفقاء نے ڈاکٹر صاحب سے تقاضا کیا تھا کہ اس کا نوٹس لیا جائے۔ اب اس

اعادہ پر یہ تقاضا فطری طور پر شدت اختیار کر گیا ــــ اِدھر اس اثناء میں مولانا اصلاحی مدظلہ اور ڈاکٹر صاحب کے مشترک حلقۂ احباب کی ایک اہم شخصیت یعنی سردار محمد اجمل خان لغاری نے خود لاہور آکر مولانا اور ڈاکٹر صاحب کے مابین 'اصلاح ذات البین' کی سعیٔ مشکور کی جس کے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اچھے نتائج رونما ہوئے ــ چنانچہ متذکرہ بالا تحریر کی اشاعتِ ثانیہ پر ڈاکٹر صاحب نے سردار صاحب ہی کو توجہ دلائی اور انہوں نے مولانا کو خط لکھا۔ اس کا جو جواب مولانا نے سردار صاحب کو دیا اُس کے چند جملے موصوف نے ڈاکٹر صاحب کو بھی لکھ بھیجے ــــ اور وہ یہ ہیں :

"شمس الاسلام' کے مضمون کے بارے میں آپ نے لکھا ہے تو گذارش ہے کہ وہ میرے ایماء پر لکھا گیا تھا نہ میرے ایماء پر دوبارہ شائع کیا گیا ہے اور نہ ہی میں اس پوزیشن میں ہوں کہ مدیرِ جریدہ کو ایسا کرنے سے باز رکھ سکوں۔ وہ اپنی پالیسی میں آزاد ہیں۔ مجھے اپنا اُستاد کہتے ہیں لیکن میری اُن سے کوئی ذاتی شناسائی نہیں ہے۔ اُن کے اس کام میں میری رضا شامل نہیں ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے اوپر اس کی کوئی ذمہ داری بھی نہیں ہے۔"

مولانا کا اس تحریر اور صاحبِ تحریر دونوں سے یہ 'اعلانِ برأت' ذاتی طور پر ڈاکٹر صاحب کے لیے تو پوری طرح کفایت کرتا ہی ہے۔ اِن شَاءَ اللّٰہُ الْعَزِیز! اس سے انجمن خدام القرآن اور 'تنظیم اسلامی' کے تمام وابستگان اور 'میثاق' کے جملہ قارئینِ کرام کی بھی پوری تشفی ہو جائے گی۔

حکیم محمد صادق صاحب سیالکوٹی کی مُرتّبہ
"بیاض الاربعین" ــ ڈیڑھ روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر منگوائیں
کتب خانہ وہابیہ: ۴۴۲م بی سیٹلائٹ ٹاؤن ــ گوجرانوالہ

فرمانِ نبوی ﷺ

"بَلِّغُوا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً"

'پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت!'

ڈاکٹر اسرار احمد

پہلی قسط

شرک اور اقسامِ شرک

اگست ۱۹۷۶ء میں راولپنڈی کی ہفت روزہ قرآنی تربیت گاہ میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے "شرک اور اقسامِ شرک"۔ "حقیقتِ ایمان" اور "حقیقتِ نفاق" پر تقاریر کی تھیں۔ راقم الحروف کی رائے میں یہ تینوں خطابات ڈاکٹر صاحب کے اہم ترین خطابات میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ راقم پہلا خطاب ٹیپ سے منتقل کر رہا ہے جس کی پہلی قسط پیشِ خدمت ہے۔ اِن شاء اللہ بقیہ اقساط بالترتیب آئندہ 'میثاق' میں پیش کی جائیں گی۔ خواہش یہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب اُس پر نظرِ ثانی کر لیتے تو اُس کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا۔ لیکن موصوف نظرِ ثانی تو درکنار اس کو سرسری طور پر پڑھنے کا بھی وقت نہ نکال سکے۔ چنانچہ اس مضمون میں اگر کوئی خطا ہے تو اُس کی ذمہ داری راقم الحروف پر ہے، جس کے لیے یہ عاجز اللہ تعالیٰ سے عفو کا طالب ہے۔ اگر صواب ہے تو وہ منجانب اللہ ہے۔ اس پہلی قسط میں "شرک فی الذّات" کی بحث مکمل ہو گئی ہے۔ اب اِن شاء اللہ دو اقساط میں "شرک فی الصّفات" اور "شرک فی الحقوق" کے مباحث بیان ہوں گے۔

جمیل الرحمٰن

~~خطبہ مسنونہ، تلاوتِ آیات اور دعا کے بعد:-~~

حضرات و خواتین!

ہمارے دین کی تعبیر کے لیے اگر کسی ایک اصطلاح کی ضرورت ہو جو اُس کی پوری حقیقت کو محیط اور اُس کے جملہ مقتضیات اور پہلوؤں پر حاوی ہو تو وہ اصطلاح یہ ہے کہ ہمارا دین ــــ دینِ توحید ہے، اور اس دین میں سب سے بڑا گناہ، سب سے بڑا جرم اور سب سے بڑی معصیت جو قطعی ناقابلِ عفو ہے، وہ شرک ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، ہر مسلمان اِس سے واقف ہے۔ میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ ہر خیر، خوبی، بھلائی اور نیکی چاہے

وہ عمل کی ہو، سیرت کی ہو، کردار کی ہو، علم اور نظریہ وخیال کی ہو وہ درحقیقت نقطۂ توحید ہی کا پھیلاؤ ہے اور ہر گمراہی، زیغ، کجی اور معصیت وضلالت، چاہے وہ اخلاق وکردار کی ہو چاہے وہ نظریہ وخیال اور علم وفکر کی ہو، اُس کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں شرک سے جاملتے ہیں۔ گویا ہمارا دین بقول علّامہ اقبال کیا ہے؟ "فقط اِک نُقطۂ ایماں کی تفسیریں" پس معلوم ہوا کہ ایک نقطۂ توحید کا پھیلاؤ ہی ہمارا دین، دینِ اسلام ہے۔ اور اِس اُصُول کے تحت کہ :۔ تُعْرَفُ الْاَشْیَآءُ بِاَضْدَادِھَا: "یعنی اشیاء کی صحیح معرفت اُن کی ضد کی پہچان سے حاصل ہوتی ہے" تو علمِ توحید کے حصُول کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ شرک اور اُس کی جُملہ اقسام کی معرفت حاصل ہوجائے اور انسان یہ جان لے کہ یہ شرک کن کن صورتوں میں حملہ آور ہوتا ہے اور کیسے کیسے بھیس بدل کر آتا ہے۔ کن کن راستوں سے توحید کی پونجی پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ چنانچہ شرک کے مکمل فہم کے حصُول کے بعد ہی کسی مسلمان کے لیے ممکن ہوجائے گا کہ وہ اپنی حقیقی اور بیش بہا متاعِ ایمان کی حفاظت کرسکے۔ جہاں تک شرک کی مذمّت کا تعلق ہے مَیں سمجھتا ہوں کہ اِس پر مجھے آپ کا کچھ وقت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ ہر مسلمان کی گھٹی میں یہ بات موجود ہے کہ وہ شرک کو ایک مذموم شے مانتا ہے ــــ اُس کو مغالطہ لاحق ہوسکتا ہے، غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ وہ شرک کی کسی نوع کو شرک ہی نہ سمجھ رہا ہو۔ پہچان ہی میں اُس سے تقصیر اور کوتاہی ہوئی ہو لیکن مسلمان کا خمیر جس مٹی سے اُٹھا ہے اور اُس کی گھٹی میں جو چیزیں پڑی ہوئی ہیں، اُن میں سے ایک شرک سے نفرت بھی ہے۔ اور وہ کوئی ایسا عمل نہیں کرسکتا جس کو وہ شعوری طور پر شرک سمجھتا ہو۔

شرک ناقابلِ عفو جرم ہے

اِس اعتبار سے شرک کی مذمّت میں مجھے دلیلیں قائم کرنے کی چنداں حاجت نہیں ہے۔ اِس مقصد کے لیے سُورۂ نساء کی یہ آیت کفایت کرتی ہے جو اسی سُورۂ مُبارکہ میں دو جگہ تقریباً ایک جیسے الفاظ میں وارد ہوئی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۝ (نساء - ۱۱۶)

بے شک اللہ اس چیز کو نہیں بخشے گا کہ اُس کا شریک ٹھہرایا جائے، اس سے نیچے جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا اور جو اللہ کا شریک ٹھہرائے گا وہ بہت دُور کی گمراہی میں جا پڑا۔

مبادا کوئی غلط فہمی راہ پاجائے اِس لیے عرض کرتا ہوں کہ اِس ارشاد کو کہ "شرک کے سوا سب کچھ معاف ہوسکتا ہے" کھلا لائسنس نہ سمجھ لیا جائے کہ اب کھلی چھوٹ مل گئی ہے، کھلا وعدہ حاصل ہوگیا ہے

لہٰذا شرک کے علاوہ جو چاہو کرو، یہ مطلب ہرگز نہیں ہے فرمایا گیا ہے کہ : وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ط ـــ یہاں اُمید ضرور دلائی گئی ہے کہ اللہ جس کے لیے چاہے گا دوسرے گناہ معاف فرما دے گا ـــ پس دوسری معصیتوں اور نافرمانیوں سے بچنے کی پُوری کوشش لازمی و لابدی ہے۔ البتہ شرک وہ گناہ ہے، وہ جُرم ہے جس کے لیے واضح طور پر اعلان کر دیا گیا کہ یہ ناقابلِ عفو و معافی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی خاص صفت

آپ کو معلوم ہے کہ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا بار بار ذکر آیا ہے۔ حضرتِ ابراہیمؑ ابُوالانبیاء ہیں، امامُ النّاس ہیں، خلیلُ اللہ ہیں لیکن اکثر و بیشتر قرآن مجید میں اُن کے ذکر کے آخر میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ : وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ط "اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا" ـــ میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ کی شرک سے براءت وہ سب سے اعلیٰ و بلند و بالا سند ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہے۔ اِسی بات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک انسان کے لیے سب سے اُونچا تصدیق نامہ اور سند (CERTIFICATE AND TESTIMONIAL) اللہ تعالیٰ کی جناب سے یہی ہے کہ وہ خود اُس کے مشرک ہونے کی نفی فرما دے : وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ط اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شرک کے کسی داغ اور دھبّے کی آلُودگی سے اپنے دامن کو بچانا کس قدر مشکل کام ہے۔ اِسی مفہوم کو علّامہ اقبالؒ نے یوں ادا کیا کہ ؎

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے ٭ ہوس چھُپ چھُپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

یہ صلاحیت کہ انسان پہچان لے کہ شرک کیا ہے اور اُس کی اقسام، اُس کے بھیس اور رُوپ کیا کیا ہیں، اِس شعر کے مصداق ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش ٭ من اندازِ قدت را می شناسم

"تم جس رنگ کا چاہو لباس پہن لو! مَیں تم کو تمہارے قد سے پہچان لوں گا" ـــ اُسی طریقہ سے شرک کی ایسی معرفت اور ایسی پہچان ایک بندۂ مومن کے لیے ضروری ہے کہ خواہ وہ کیسے ہی بھیس بدل کر آئے، کیسی ہی شکلیں اختیار کرے، مسلمان اُس کو پہچان لے ـــ وہ جان لے کہ شرک کی بیماری کس لبادے میں مستور ہے، یہ شراب کس نئی بوتل اور نئے لیبل کے ساتھ آئی ہے لیکن اپنی جگہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ شرک کی لعنت و معصیت کی پہچان آسان کام نہیں اور نہ یہ ہر کس و ناکس کے بس کا روگ ہے۔ یہ ایسی موذی بلا ہے اور ایسے بھیس بدل کر متاعِ ایمان پر چھاپا مارتی ہے کہ غیر محسوس اور

خیر شعوری طور پر خود اہلِ ایمان اور مدعیانِ توحید کی اکثریت کے لیے بھی اُس کی چھوت سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے، جیسا کہ سورۂ یوسف میں فرمایا:

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ ۝ (آیت ۱۰۶) "اور اُن (مدعیانِ ایمان) میں سے اکثر اللہ پر (حقیقی و کامل توحید کے ساتھ) ایمان نہیں رکھتے (ایمان رکھتے ہیں) مگر اس طرح کہ ساتھ ہی اس کے شریک بھی ٹھہرائے ہوئے ہیں۔"

اس آیتِ کریمہ سے شرک کی ہمہ جہتی اور ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا ہے۔ درحقیقت شرک توحید کی ضد ہے اور شیطان کا سب سے بڑا اجال اور سب سے بڑا فریب ہے جس سے وہ کھلے مشرکوں کے مقابلے میں مدعیانِ توحید کو شکار کرنے کے لیے اپنے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔

اقسامِ شرک کا استقصاء حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق کتب سیر میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ اُن کے سامنے کسی شخص کے زُہد و تقویٰ اور عبادت و برّ کی تعریف اِن الفاظ میں کی گئی کہ "وہ جانتا ہی نہیں کہ گناہ کیا ہے"۔ تو حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ "ایسے شخص کا گناہ میں مبتلا ہونے کا بہت زیادہ احتمال و امکان ہے"۔ چنانچہ شرک کی لعنت اور شیطان کے اِس فریب سے بچنے کی واحد صورت یہ ہے کہ اقسامِ شرک کا استقصاء کیا جائے، اُس کی معرفت حاصل کی جائے۔ اُس کے ہر بھیس اور رُوپ کو سمجھا جائے تاکہ اُس سے محفوظ و مامون رہنے کی ہر مسلمان شعوری طور پر کوشش کر سکے۔

تقسیم در اقسام لہٰذا میری آج کی گفتگو کا اصل موضوع اقسامِ شرک ہے۔ شرک کی قسموں کو مختلف انداز و اُسلوب سے بیان کرنے کی کوششیں ہر دور میں کی جاتی رہی ہیں۔ مثلاً بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شرک اعتقادی ہوتا ہے اور ایک شرک عملی ہوتا ہے۔ یعنی شرک کی بڑی بڑی دو اقسام مُعیّن کی جاتی ہیں۔ ایک شرک اعتقادی دوسرا شرک عملی۔ ایک تقسیم یہ بھی کی گئی ہے کہ کچھ شرک جلی ہوتے ہیں اور کچھ شرک خفی ہوتے ہیں یعنی شرکِ جلی اور شرکِ خفی ——— میں جس نہج پر اقسامِ شرک کا ایک خاکہ آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں وہ اُن تقسیموں سے قدرے مختلف ہے۔ میں اپنے مطالعۂ خاص کر قرآن مجید میں غور و تدبّر کے نتیجے میں جہاں تک سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ شرک کی تین نمایاں ترین اقسام ہیں:-

شرک کی تین اقسام ایک شرک ہے، شرک فی الذّات، دوسرا شرک ہے، شرک فی الصفات اور تیسرا شرک ہے، شرک فی الحقوق جسے شرک فی العبادت بھی کہا جا سکتا ہے ———

شرک فی الذّات یہ ہے کہ خدا کی ذات میں کسی کو اُس کا ساجھی، اُس کا ہمسر، اُس کا ہم کفو، اُس کا ہم پلّہ، اُس کا نِد اور اُس کا ضِد بنا دیا جائے۔ یہ عریاں ترین شرک ہے، بدترین شرک ہے، سب سے گھناؤنا شرک ہے۔ اِس کی ایک تعبیر یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اُس کے مقامِ ارفع و اعلیٰ سے گرا کر اُس کو مخلوق کی صف میں لا کھڑا کیا جائے۔ یا مخلوق میں سے کسی کو اُٹھا کر اُس کو اللہ تبارک و تعالیٰ عزّ و جلّ کے برابر لا بٹھایا جائے۔

شرک فی الصّفات یہ ہے کہ خدا کی صفات میں مخلوقات میں سے کسی کو اُس کا ہمسر بنا دیا جائے مشابہت پیدا کر دی جائے۔ اللہ کی صفات میں سے کسی مخلوق کے لیے بھی کوئی ابدی صفت تسلیم کی جائے۔ مخلوقات میں سے بھی کسی کو رازق، خالق، سمیع و بصیر، مولا، دستگیر، حامی و ناصر اور حاضر و ناظر بالفعل و بالذّات مان لیا جائے۔ صفاتِ الٰہی کے لیے دیوتا اور دیویاں گھڑلی جائیں، مظاہرِ قدرت کو آزادانہ تصرّف اور نفع و ضرر پہنچانے والا تسلیم کر لیا جائے۔

شرک فی الحقوق یہ ہے کہ خدا کے حقوق میں سے کسی حق میں مخلوقات میں سے کسی کو اللہ کے برابر لا کر بٹھا دیا جائے، براجمان کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ صرف اُس کی اطاعت کی جائے اور اُس کی اطاعت کے دائرے میں مخلوقات میں سے اُن کی اطاعت کی جائے، جن کی اطاعت کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ اور اُسی حد تک کی جائے جس حد تک اطاعت کا حکم ہے۔ اللہ کا حق ہے کہ صرف اُس کی عبادت کی جائے، صرف اُسی سے دُعا کی جائے۔ اللہ کا حق ہے کہ ہر قسم کے مراسمِ عبودیّت اُسی کے لیے بجا لائے جائیں۔۔۔ اللہ کا حق ہے کہ صرف اُس سے محبّت کی جائے اور مخلوقات میں سے ہر ایک کی محبّت اللہ کی محبّت کے تابع ہو۔ اللہ کا حق ہے کہ خوف و رجا اور بیم و امید صرف اُس کی ذات سے وابستہ ہو۔۔۔ اللہ کی اطاعت سے آزاد کسی کی اطاعت کرنا، اللہ کے سوا مخلوقات میں سے کسی کے لیے مراسمِ عبودیّت بجا لانا جیسے کسی اور کے لیے رکوع و سجود، نذر و نیاز، کسی اور سے طلبِ اعانت و حمایت کرنا۔ اللہ کے برابر یا اُس سے زیادہ مخلوق میں سے کسی سے محبّت کرنا اور اللہ کے ساتھ ہی مخلوقات میں سے کسی کے ساتھ توقّعات کی وابستگی کرنا، یہ تمام افعال و اعمال اور نظریات و معتقدات شرک فی الحقوق ہیں۔

اسی شرک فی الحقوق کی تعبیر کے لیے دوسری اصطلاح ہے شرک فی العبادت۔ چونکہ جب اللہ تعالیٰ کے جملہ حقوق کو جمع کیا جائے تو وہ حقوق فی العبادت قرار پائیں گے۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ "میں نے جنّوں اور انسانوں کو

نہیں پیدا کیا مگر صرف اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں" ایک جگہ فرمایا : وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ؕ "اور عبادت میں اپنے ربّ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے"۔ شرک فی العبادت ایک ایسی جامع اصطلاح ہے کہ شرک فی الحقوق کے جملہ پہلوؤں کا اس ایک اصطلاح میں پورا احاطہ ہو جاتا ہے۔

تین اہم عنوانات اقسامِ شرک کو سمجھنے کے لیے یہ تین عنوانات اپنے ذہن کی لوح پر کندہ کر لیجیے۔ چونکہ ان ہی کے صحیح شعور و فہم اور ادراک پر ہمارے دین کی اساس یعنی توحید کی صحیح معرفت کا انحصار اور دار و مدار ہے۔ اِس کی اہمیّت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس کلمۂ شہادت کی ادائیگی سے ہم مسلمان قرار پاتے ہیں اُس کا پہلا جزو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے۔ اِسی توحید کے اثبات سے قبل ہر قسم کے معبودات کی نفی ہے۔ عربی قاعدے کے مطابق لَا نفیٔ جنس ہے۔ یعنی پہلے ہر نوع اور ہر قسم کے شرک سے برأت کا اظہار ہے اور پھر اللّٰہ کی توحید کا اقرار و اعلان ہے۔ اِسی بات کو سُورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۶ میں اِس اسلوب سے بیان فرمایا گیا کہ : فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ "پس جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللّٰہ پر ایمان لایا اُس نے مضبوط رسّی پکڑی جو ٹوٹنے والی نہیں"۔ یہاں طاغوت کا کُفر و انکار ایمان باللّٰہ پر مقدّم کیا گیا ہے۔ طاغوت ہر اُس نظریہ و خیال، فکر و علم اور عمل و فعل کو کہا جاتا ہے جو شیطان کے وساوس و اغوا کی وجہ سے ظہور پذیر ہوں گویا شرک کی ایک تعبیر اطاعتِ طاغوت بھی ہے، جس سے مراد شیطان کی پیروی ہے (جاری)

صفات کی کمی کی وجہ سے شرک فی الذات کی بحث رو کنی پڑی۔ یہ ان شاء اللہ آئندہ پیش ہوگی۔

مولانا امین احسن اصلاحی کی ایک اہم تصنیف

اسلامی قانون کی تدوین ——— قیمت ۵ روپے

ہمارے ملک میں اسلامی قانون کے نفاذ کا مطالبہ پاکستان کے قیام کے آغاز ہی سے موجود ہے اس قانون کے نفاذ کی طرف رہنمائی میں مولانا موصوف کی یہ تصنیف انتہائی مفید ہو سکتی ہے۔

مکتبہ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

قسط اوّل

دعوت اِلی اللہ

(تاریخ کے آئینے میں)

مولانا وصی مظہر ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ العلی العظیم، والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم محمدن وعلیٰ آلہٖ واصحابہ اجمعین۔

دعوت الی اللہ دراصل نوعِ انسانی کی اس عظیم الشان تحریک کا عنوان ہے جسے انبیاء کرام علیہم السّلام کی ہدایت اور رہنمائی میں انسانوں کو غیر اللہ کی بندگی سے نکالنے اور پوری زندگی کو اللہ کی بندگی و اطاعت کے مطابق بنانے کے لیے ہر ملک اور ہر قوم میں ہر دور اور ہر زمانے میں برپا ہوتی رہی ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ۔	اور یقیناً ہم نے ہر اُمّت میں ایک رسول کو (یہ پیغام دے کر) اٹھایا کہ اللہ کی بندگی کرو اور (اللہ کے سرکشوں) کی بندگی سے بچو!

یہی تحریک تھی جس کو خاتم النبیین محمد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کامیابی کے ساتھ اس کی تمام منازل سے گزارا اور اپنے بعد کے لوگوں کے لیے ایسا کامل نمونہ چھوڑا جو قیامت تک نوعِ انسانی پر اللہ کی حجّت ہے اور جو دعوت الی اللہ کے علم برداروں کے لیے ہر قسم کے حالات میں ایک روشن مشعل ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝	اے نبی! یقیناً ہم نے تم کو (حق کا) گواہ بنا کر بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر اور اللہ کے اذن سے اسی کی جانب دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنے نفس اور شیطان کی اور اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی بندگی سے نکال کر صرف ایک اللہ کی بندگی اور اطاعت میں داخل کیا جائے۔ یوں تو اللہ کی بندگی اور اطاعت انسان کی عین فطرت کا تقاضا ہے۔ چنانچہ دُنیا میں انسان کے آنے سے قبل ہی اس کی تمام ذریت نے اپنی بندگی اور اللہ تعالیٰ کی رُبوبیت کا اقرار کیا تھا۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے بنی آدم کی پیٹھ سے اُن کی ذُرّیت کو نکالا اور ان کو خود انہی کے اوپر گواہ بنایا (پوچھا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا کیوں نہیں (تو ہی تو ہمارا رب ہے) ہم نے گواہی دی۔

یہی وجہ ہے کہ انسان اگر اپنی اس حقیقی فطرت پر قائم ہو تو بندگیٔ رب کے بغیر اس کا جینا ویسا ہی دُوبھر ہو جائے جس طرح مچھلی کا پانی کے بغیر اور حیوانات کا ہوا کے بغیر جینا محال ہوتا ہے۔ لیکن یہ انسان کی بدبختی ہے کہ وہ اکثر اپنے حواسِ خمسہ کا غلام بن کر اپنے مالکِ حقیقی کا محض اس وجہ سے انکار کر بیٹھتا ہے کہ وہ اُس کے حواس کی گرفت سے باہر ہے۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ اپنی خواہشات کی تکمیل میں وہ ایسا اوقات ایسا اندھا ہو جاتا ہے کہ اُسے وہ حقیقتیں نظر ہی نہیں آتیں جو اس کی خواہشات کے خلاف پڑتی ہوں۔ پھر شیطان بھی انسان کو پھانسنے کے لیے مکر و فریب کے ایسے جال بچھاتا ہے جن سے بچ نکلنا بہت ہی دشوار ہے۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ جب معاشرے پر غلط کار افراد مسلّط ہو جاتے ہیں تو وہ اپنی گمراہ کن تعلیم و تربیت سے اصل فطرتِ انسانی کو مسخ کر ڈالتے ہیں۔ جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ (اوکما قال)

ہر بچہ (صحیح) فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے پھر اس کے والدین (معاشرہ) اس کو یہودی، عیسائی یا مجوسی بنا ڈالتے ہیں۔

چنانچہ ان مختلف اسباب کی بنا پر بندگیٔ رب کی فطری پکار اکثر حالات میں دب کر ایسی مخفی ہو جاتی ہے کہ ظاہر پرست لوگ اس کے وجود ہی کا انکار کر بیٹھتے ہیں۔ اور

انسانوں سے بالاتر کسی ہستی کو اپنا رب ماننا جہالت اور تاریک خیالی کی علامت سمجھتے ہیں!!

علاوہ ازیں انسانوں کی ایک کثیر تعداد جو ضعفِ ارادہ کے مرض میں گرفتار ہوتی ہے۔ وہ طاعت و زہد کا ثواب جانتے ہوئے بھی ادھر طبیعت نہ آنے کا شکوہ کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح نافرمانی اور بغاوت کے بُرے نتائج کا تجربہ کر لینے کے بعد بھی خواہشاتِ نفس سے مغلوب ہو کر بغاوت ہی کی روش پر گامزن رہتی ہے۔

انہی وجوہ کی بنا پر ہر دور میں ایسے داعیانِ حق کا وجود ناگزیر ہے جو پیکرِ محسوس کے خوگر کو معرفتِ الٰہی سے بہرہ ور کریں۔ بندگانِ نفس کو بندگیٔ رب کے لطف سے آشنا کریں۔ غلط ماحول اور غلط معاشرے کے سحر میں گرفتار افراد کو حُرّیتِ فکر و عمل کی نعمت سے مالامال کریں اور جو خود فراموشی و خدا فراموشی کے پردوں کو چاک کر کے فکرِ آخرت اور تقویٰ کی صفات سے انسانی کردار کو آراستہ کر دیں۔

اسی لیے سیدنا آدم علیہ السلام کو دنیا میں بھیجتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ نوعِ انسانی کی ہدایت و رہنمائی کا ضرور اہتمام فرمائے گا۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى	تو اگر تمھارے پاس میری جانب سے کوئی
فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ	ہدایت آئے (اور وہ ضرور آئے گی) تو جو
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝	لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے نہ ان
	کے لیے کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے کی تکمیل اس طرح فرمائی:

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا	اور کوئی اُمّت ایسی نہیں ہے جس میں کوئی
نَذِيْرٌ	نہ کوئی ڈرانے والا نہ گزرا ہو۔
اور: لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ	ہر قوم میں ایک نہ ایک ہدایت کا راستہ
	دکھانے والا ہوتا ہی چلا آیا ہے

جب تک دین کی تکمیل نہ ہوئی تھی اور انسانیت بلوغِ عقلی کو نہ پہنچی تھی اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق ہر ملک اور ہر قوم میں نبیوں اور رسولوں کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن جب دین کی تکمیل کا وقت آیا اور انسان ایک عالمی پیغام کا بار اٹھانے کے لائق بن

گیا تو خاتم النبیین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ نے دعوت الی اللہ کا ایسا کامل زندہ و تابندہ نمونہ دنیا کے سامنے رکھ دیا جس سے ہدایت حاصل کر کے ہر ملک اور ہر زمانے میں علماء و صلحاء اور مجددین و مصلحین کا ایک روشن سلسلہ قائم ہو گیا۔ آج اس روشن سلسلہ کی کڑیوں سے ملتِ اسلامیہ کی تاریخ کا ہر ورق تابناک ہے۔

اس سلسلہ کے صاحبانِ عزیمت نے نہ کسی رکاوٹ کی پروا کی نہ کسی مخالفت کو خاطر میں لائے، نہ راہِ حق کی صعوبتیں ان کی ہمتوں کو پست کر سکیں اور نہ اس راہ میں جان و مال کی کسی بڑی سے بڑی قربانی کو انہوں نے دشوار یا گراں سمجھا۔ اس طرح یہ لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس پیشین گوئی کا مصداق ٹھہرے جس میں آپ نے فرمایا تھا:

لَا یَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ	میری امت میں ایک گروہ ہمیشہ ایسا رہے گا
ظَاهِرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَا یَضُرُّهُمْ	جو حق پر استوار اور قائم رہے گا۔ ان کی مخالفت
مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ	کرنے والے اُن کو نقصان نہ پہنچا سکیں گے
(او کما قال)	یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آجائے۔

ہم اپنے اس سلسلۂ گفتگو میں انہی صاحبانِ عزیمت کے کارناموں کو اُن کے تاریخی پس منظر میں بیان کر کے اپنے ایمان کی تازگی کا اہتمام کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس سلسلہ کو شروع کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں انبیاءِ کرام علیہم السلام کی دعوت کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے، اس پر اجمالی نگاہ ڈال لیں۔ اس تاریخ کے مطالعہ سے ہم پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ دعوتِ حق کن کن منزلوں اور مرحلوں سے گزرتی ہے اور ہر منزل اور ہر مرحلے میں انبیاءِ کرام علیہم السلام کے کام کا انداز کیا ہوتا ہے؟

اس مطالعہ کا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم اس کی روشنی میں اُن داعیانِ حق کے کارناموں کی قدر و قیمت کا صحیح صحیح اندازہ لگا سکیں گے۔ جو ملتِ اسلامیہ کو منہاجِ نبوت پر قائم کرنے اور قائم رکھنے کے لیے سرفروشانہ انداز سے علمی اور عملی میدان میں جدّ و جہد کرتے رہے ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۝

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ

(رضی اللہ تعالیٰ عنہما)

از قلم: محترمہ جمیلہ شوکت صاحبہ

شعبۂ علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب

عبداللہ بن عباسؓ بن عبدالمطلب ۳ ق ھ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے[1]۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ کا نام رکھا اور اپنا لعابِ دہن مبارک آپؓ کے منہ میں ڈالا[2]۔ خانوادۂ نبوت میں پرورش پائی اور نبی کریم صلعم کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ نبی کریم صلعم کی تربیت اور خداداد علم و بصیرت کی بنا پر صحابہ کرام میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ نبی کریم صلعم کے وصال کے بعد مدینہ منورہ میں احادیث کو جمع کرنے کی طرف پوری توجہ دی۔ ابنِ عباسؓ کا قول ہے :- انہ وجد عامۃ علم أصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عند الانصار[3]۔ حضرت ابن عباسؓ نے زندگی کا بیشتر حصہ درس و تدریس میں بسر کیا اور امارت و حکومت کی مصروفیات سے محترز رہے[4]۔

نبی کریم صلعم نے ان کی فراست، ذہانت اور دین میں سمجھ بوجھ کو پسند فرمایا اور متعدد بار علم و حکمت اور فہم و بصیرت میں اضافہ کی دعا فرمائی۔ آپؐ کا ارشاد ہے :- اللّٰھم علمہ الحکمۃ والتأویل۔ بعض روایات میں یہ دعا اس طرح منقول ہے : اللّٰھم فقھہ فی الدین وعلمہ التأویل[5]۔ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریمؐ نے مختلف اوقات میں مختلف الفاظ میں دعا فرمائی اور یہ

---

[1] سنِ پیدائش کے بارے میں تین مختلف روایات ہیں لیکن ۳ ق ھ والی روایت کو اوثق مانا گیا ہے۔ المستدرک: حاکم ۳ : ۵۳۳ الاصابۃ ۲ : ۳۲۲، الاستیعاب ۲ : ۳۴۳ تاریخ الخمیس ۱۸۹۔

[2] مجمع الزوائد، ۹ : ۲۷۵

[3] جامع بیان العلم وفضلہ : ابن عبداللہ ۱ : ۹۶

[4] صرف حضرت علیؓ کے عہد میں بصرہ کے گورنر رہے۔

[5] الاصابہ، ۲ : ۳۲۳، ۳۲۲۔ الاستیعاب ۲ : ۳۴۴ (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا کا ہی نتیجہ تھا کہ ابن عباسؓ کو الحبر البحر، ربّانی الامّۃ جیسے عظیم خطابات سے نوازا گیا۔

ابن عباسؓ میں تحقیق و تجسس کا مادّہ بہت زیادہ تھا۔ جب تک کسی مسئلہ کے بارے میں اطمینان حاصل نہ کر لیتے، خاموش نہ ہوتے۔ اس تدبّر و تفکّر اور تحقیق کے نتیجہ میں کم عمری ہی میں پختہ ذہن اور فکرِ رسا کے مالک ہو گئے تھے۔ حافظہ اور زورِ بیان بھی مثالی تھا[۶]۔ ایک عرصہ تک طالبانِ علم براہِ راست اس چشمۂ صافی سے سیراب ہوتے رہے، آخر یہ عظیم المرتبت صحابی اور خانوادۂ نبوت کا یہ مایۂ ناز فرزند ۷۱ سال کی عمر میں ۶۸ھ میں طائف میں خالقِ حقیقی سے جا ملا[۷]۔

ابن عباسؓ متداول علوم مثلاً حدیث، تفسیر، شعر، کلام اور نسب میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور اجتہاد میں بلند مقام پر فائز تھے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباس نے لوگوں کے اژدحام کی وجہ سے ہفتہ کے ایام مختلف علوم کے لیے مخصوص فرما دیئے تھے۔ لہٰذا لوگ تفسیر، فقہ، کلام اور شعر وغیرہ کے بارے میں دریافت کرنے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے اور دامن بھر کر واپس لوٹتے[۸]۔ عطاء نے ان کی مجلس کے بارے میں کہا: "میں نے ابنِ عباسؓ کی مجلس سے اچھی کوئی مجلس نہیں دیکھی۔ ما رایت قط اکرم من مجلس ابن عباس اکثر فقھا واعظم خشیۃ ان اصحاب الفقہ عندہ واصحاب القرآن عندہ واصحاب الشعر عندہ یصدرھم کلھم من واد واسع[۹]۔

عباسؓ کے تبحرِ علمی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ تفسیرِ قرآن اور فتویٰ میں امام تسلیم کیے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ اور عثمانؓ کے دور میں فتویٰ دیا کرتے تھے[۱۰]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بخاری کتاب الوضوء فی کتاب فضائل اصحاب النبیؐ، اسد الغابہ ۳: ۱۹۳، طبقات ابن سعد ۲: ۳۶۵۔ تہذیب التہذیب ۵: ۲۷۸ ؛

۶ مستدرک ۳: ۵۴۴، ۵۴۵۔ الاصابۃ، ۲: ۳۲۲، ۳۲۳۔ الاستیعاب ۲: ۳۴۴

۷ سنِ ولادت کی طرح سنِ وفات میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے لیکن جمہور کے قول کے مطابق ۶۸ھ ہے۔ المستدرک، ۳: ۵۴۳۔ الاستیعاب ۲: ۳۴۴۔ کتاب نسب قریش ۲۶، تاریخ الخمیس ۱۸۹، الاصابہ ۲: ۳۲۶ ؛

۸ طبقات ابن سعد، ۲: ۳۶۸۔ اسد الغابہ، ۳: ۱۹۳ ؛

۹ الاصابۃ، ۲: ۳۲۴ ۱۰ طبقات ابنِ سعد، ۲: ۳۶۶

اللہ تعالیٰ نے ابنِ عباسؓ کو قرآن فہمی کی وافر دولت سے نوازا تھا۔ وہ قرآن کے الفاظ میں گہری بصیرت رکھتے تھے اور اُس کے مخفی معنی سمجھتے تھے۔ عبداللہ ابن مسعودؓ نے اُن کی قرآن فہمی کی تعریف کی اور فرمایا : نعم ترجمان القرآن[۱۱]۔ حضرت عمرؓ اُن کو اپنی مجلس میں مشائخِ بدر کے ساتھ جگہ دیا کرتے تھے اور اُن کی پیش کردہ تفسیر کو دوسرے صحابہؓ کی تفسیر پر ترجیح دیا کرتے تھے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن حضرتِ عمرؓ نے صحابۂ کرام سے آیت : اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ط کی تفسیر دریافت فرمائی۔ بعض صحابہؓ نے فرمایا کہ اس آیت میں حکم دیا گیا ہے مدد اور فتح کی صورت میں کہ ہم اس کی تعریف بیان کریں اور اس سے مغفرت طلب کریں۔ بعض دوسرے صحابہؓ نے اس سلسلے میں سکوت فرمایا۔ اِس کے بعد حضرت عمرؓ ابنِ عباسؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ اس آیت کی تفسیر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے اُن کی تائید کی اور تفسیر کو پسند کیا[۱۲]۔ اگر کوئی شخص کسی صحابی سے کسی آیت کی تفسیر دریافت کرتا تو صحابہؓ سائل کو ابن عباسؓ کی طرف رجوع کرنے کے لیے فرماتے۔ ایک دفعہ ایک شخص عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آیت : كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا[۱۳] کی تفسیر پوچھنے کے لیے آیا تو انہوں نے اس کو ابنِ عباسؓ سے دریافت کرنے کے لیے کہا اور ہدایت کی کہ جب وہ تفسیر معلوم کر کے آئے تو انہیں خبر دے سو جب سائل نے ابن عمرؓ کو تفسیر بتائی تو وہ خوش ہوئے اور فرمایا : لَقَدْ اُوتِیَ ابن عباس علماً صدقاً[۱۴]۔

ابو وائل روایت کرتے ہیں حضرت علیؓ نے عبداللہ بن عباس کو حج کے موقع پر لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ پر امیر مقرر کیا۔ آپ نے اپنے خطبہ میں سُورۂ بقرہ یا سُورۂ نُور پڑھی اور اُس کی ایسی تفسیر کی کہ اگر رُومی، ترکی، اور دیلمی سُن لیتے تو ضرور ایمان لے آتے[۱۵]

حضرت علیؓ اُن کی بصیرت اور قرآن فہمی کی تعریف میں فرماتے ہیں : کانما ینظر الی

الغیب من ستر رقیق[۱]۔ حضرت ابن عمرؓ ان کی دقتِ نظر اور فہم رسا کا اعتراف یوں فرماتے

[۱۱] الاصابۃ، ۲ : ۳۲۴ طبقات ابن سعد، ۲ : ۳۶۶

[۱۲] المستدرک ۳ : ۵۳۹، سیر اعلام النبلاء ۳ : ۲۳۰، ۲۳۱۔ تفسیر ابن کثیر ۴ : ۵۶۱ صحیح بخاری فی کتاب تفسیر القرآن ؛ [۱۳] الانبیاء، ۳۰ ؛ [۱۴] الاصابہ، ۲ : ۳۲۴

[۱۵] المستدرک، ۳ : ۵۳۷، الاصابہ ۲ : ۳۲۵ [۱۶] الاصابہ، ۲ : ۳۲۴ ؛

ہیں: انہ اعلم امۃ محمد بما انزل علی محمد ﷺ۔ حق تو یہ ہے کہ ابن عباسؓ نابغۂ روزگار تھے۔ اور ان کی علمی حیثیت مسلّم تھی۔ سعد بن ابی وقاص کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد کو ابن عباس کے بارے میں کہتے سنا: ما رأیت احدًا احضر فهمًا ولا البب لبًّا ولا اکثر علمًا ولا اوسع حلمًا من ابن عباس[۱۸]۔ ان کی وفات امتِ مسلمہ کے لیے ایک عظیم سانحہ تھا۔ ابن الحنفیہ نے جب وفات کی خبر ملی تو فرمایا: الیوم مات ربانی وحبر هذه الامة[۱۹]۔

عبداللہ ابن عباس کی تفسیر کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ جب صحابہؓ کو ابن عباسؓ کی کوئی مستند روایت مل جاتی تو دوسری روایات پر ان کی روایت کو ترجیح دیتے تھے جیسا کہ زرکشی کہتے ہیں:۔

قول ابن عباس مقدم علی قول غیره من الصحابة عند تعارض ما جاء عنهم فی التفسیر[۲۰]۔ ابن عباسؓ نے مکہ میں ایک مستقل مدرسۂ تفسیر کی بنیاد رکھی جہاں دوسرے علاقوں کے لوگ بھی استفادہ کے لیے آتے تھے۔ اس مدرسہ کے تلامذہ کی تفسیری روایات کو محض اس لیے قبول عام حاصل ہوا کہ انھوں نے ابن عباسؓ سے استفادہ کیا تھا۔ ابن تیمیہ رقم طراز ہیں:۔

اما التفسیر فاعلم الناس به اهل مکة لانهم اصحاب ابن عباس کمجاهد وعطاء وعکرمة[۲۱]..... ابن عباسؓ کا طریقۂ تفسیر:۔ حضرت ابن عباسؓ کا طریقۂ تفسیر دیگر صحابہ کی طرح تھا۔ وہ آیاتِ قرآنی کی تفسیر سب سے پہلے قرآنِ حکیم میں تلاش کرتے کیونکہ:۔

القرآن یفسر بعضه بعضًا اور اگر وہاں وضاحت نہ ملتی تو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع فرماتے کہ:

القرآن احوج الی السنة من السنة الی القرآن۔ اس کے بعد آثار و اقوال خلفاء راشدین سے رہنمائی حاصل کرتے اور پھر اجتہادی بصیرت سے کام لیتے[۲۲]۔ لیکن وہ رائے کے استعمال میں دیگر صحابہؓ کی طرح بڑے محتاط تھے اور رائے دینے سے ڈرتے تھے، فرماتے تھے:۔

انما هو کتاب اللہ وسنة رسوله صلی اللہ علیہ وسلم فمن قال بعد ذلک شیئًا فما

---

[۱۷] الاصابہ، ۲: ۳۲۴ ۔ تہذیب، ۵: ۲۷۸

[۱۸] طبقات ابن سعد ۲: ۳۶۹

[۱۹] طبقات ابن سعد ۲: ۳۶۷ ۔ اسد الغابہ ۱: ۱۹۵ ۔ الاستیعاب ۲: ۳۴۴

[۲۰] الاتقان فی علوم القرآن ۲: ۱۸۳ [۲۱] مقدمہ فی اصول التفسیر ۱۵ مطبعۃ الترقی دمشق ۱۹۳۶ء ۔ [۲۲] الاصابہ ۲: ۳۲۵ ۔ طبقات ابن سعد،

ادری أنی حسناتہ یبعد أم فی سیأتہ[۲۳]

حضرت ابن عباسؓ احادیث رسولؐ سے بے پناہ شغف رکھتے تھے اور ان کا یہ شغف تفسیر قرآن میں بے حد ممد ثابت ہوا۔

عبداللہ بن عباس مسعود ابن تفسیر بعض غریب الفاظ کی تشریح و توضیح کے لیے شعر جاہلی کی طرف بھی رجوع فرماتے تھے۔ شعر جاہلی سے استشہاد میں ابن عباس دوسرے کبار صحابہ کرام کے مقلد تھے حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے علیکم بدیوانکم فان فیہ تفسیر کتابکم و معانی کلامکم[۲۴] حضرت عمرؓ کا شعر جاہلی سے استشہاد کو بنظر تحسین دیکھنا اس واقعہ سے بھی ظاہر ہوجاتا ہے۔ آپ نے ایک دفعہ صحابہ کرامؓ سے آیت : او یأخذھم علی تخوف[۲۵] کی تفسیر دریافت فرمائی تو حاضرین میں سے ایک شخص نے کھڑے ہوکر کہا کہ "تخوّف" کے معنی کم ہونا کے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اس سے دریافت فرمایا کہ کیا عربوں نے اسے اپنے کلام میں استعمال کیا ہے تو اس شخص نے فوراً ایک شعر پڑھ کر سنایا جس سے اس کے معانی کی تائید و توثیق ہوگئی[۲۶]۔

ابن عباس کو لغتِ عربی پر اتنی قدرت حاصل تھی کہ جب کوئی شخص ان سے قرآن کے کسی معنی کو دریافت کرتا تو آپ عام طور پر معانی کی وضاحت اور تائید کے لیے شعر پیش کردیا کرتے تھے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نافع بن ازرق خارجی اپنے چند ساتھیوں کی ہمراہی میں ابن عباس کی علمیّت کا امتحان لینے کی غرض سے آیا اور کہا کہ آپ ہم کو قرآن کی بعض آیات کی تفسیر بتائیں اور کلامِ عرب سے بھی استشہاد کریں۔ ابن عباس نے نافع کے تمام سوالات کا شافی جواب[۲۷] دیا اور نافع خاموشی سے اُٹھ کر چلا گیا۔

ابن عباس نے تفسیر میں غریب القرآن کو سمجھنے کے لیے اس مصدر کی اہمیت کو بخوبی سمجھا جیسا کہ ابن الانباری کہتے ہیں کہ ابن عباس نے فرمایا : اذا سألتمونی عن غریب القرآن فالتمسوہ فی الشعر فان الشعر دیوان العرب[۲۸] بعد میں آنے والے مفسرین نے غریب قرآن

۲۳ جامع بیان العلم وفضلہ ۲ : ۲۶

۲۴ الموافقات فی اصول الشریعۃ۔

۲۵ النحل : ۴۷ ۲۶ الموافقات ۲ : ۸۸

۲۷ الاتقان فی علوم القرآن ۱ : ۱۲۰

۲۸ الاتقان فی علوم القرآن ۱ : ۱۹۱

کی تشریح کے لیے ابن عباس کا تتبع کیا اور ان سے خوشہ چینی کی گولڈزیہر رقم طراز ہے:۔
ھوالذی ابدع الطریقۃ اللغویۃ لتفسیر القرآن[۲۹] یعنی تفسیر قرآن کے لیے لغوی طریقہ کا باقاعدہ طور پر آغاز ابن عباس ہی نے کیا۔

ابن عباس کے مصادر تفسیر میں ایک اہم مصدر اسرائیلیات بھی تھا۔ آپ اہل کتاب سے ان واقعات کو بیان کرتے تھے جن کا ذکر قرآن، تورات اور انجیل میں متفقہ طور پر ہوا ہے لیکن قرآن حکیم میں اجمال و اختصار ہے جبکہ دوسری کتب میں وہ واقعات تفصیل سے بیان ہوئے ہیں نیز اہل کتاب کی طرف رجوع کرنا نصوص کی روشنی میں[۳۰] تھا اور ایک محدود دائرے میں تھا۔ اور جس کا تعلق عقیدہ و شریعت سے نہیں ہوتا تھا۔

بعض تنگ نظر متعصب اہلِ علم مثلاً گولڈزیہر، احمد امین البوریۃ وغیرہ نے صحابہ کرام اور بالخصوص ابن عباس پر اہل کتاب سے بغیر نقد و جرح کے نقل کرنے کا الزام و اتہام لگایا ہے ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم[۳۱] کے منع کرنے کے باوجود ایسا کیا۔ گولڈزیہر کہتا ہے: "ابن عباس الفاظ کی تشریح کے لیے ابوالجلا غیلان کی طرف رجوع کرتے تھے آگے کہتا ہے: "ابن عباس کے مصادر علم وہ یہودی تھے جو اسلام لے آئے تھے۔" پھر کہتا ہے: "ابن عباس کعب الاحبار وغیرہ سے قرآن کی صحیح تفسیر پوچھا کرتے تھے۔ کیونکہ یہود علم و فہم میں اعلیٰ درجے پر تھے اور لوگوں کا خیال تھا کہ قرآن و سنت کی صحیح تفسیر و تعبیر وہی سمجھ سکتے ہیں[۳۲] احمد امین اس اتہام میں اس مستشرق کے ہمنوا نظر آتے ہیں وہ لکھتے ہیں: "ولم یتحرج حتی کبار الصحابۃ مثل ابن عباس من اخذ قولھم روی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال (اذا حدثکم اھل الکتاب فلا تصدقوھم ولا تکذبوھم) ولکن العمل کان علی غیر ذلک وانھم کانوا یصدقونھم وینقلون عنھم۔ ایک اور مقام پر کہتے ہیں: وقد اخذ عنہ (یعنی کعب) اثنان ھما اکبر من نشر علمہ۔ ابن عباس۔ وھذا یعلل مافی تفسیرہ من اسرائیلیات

۲۹؎ مذاھب التفسیر الاسلامی، ۹۰ مکتبہ خانجی مصر ؎
۳۰؎ آل عمران: ۹۳۔ صحیح بخاری ۲: ۱۷۵ ؎
۳۱؎ صحیح بخاری، ۶: ۲۵، ۳: ۲۷۳ ؎
۳۲؎ مذاہب التفسیر الاسلامی، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸ ؎

۔ و ابو ھریرۃ[۳۳]۔ سیّد رشید رضا فرماتے ہیں :۔ ابن عباس روی عن کعب وکان یصدقہ[۳۴] ابو ریّہ بھی صحابہ کرامؓ پر اسی قسم کے الزامات لگاتا ہے : تلقی الصحابۃ ومن تبعھم کل ما یلقیہ ھؤلاء الدھاۃ یعنی عبد اللہ بن سلام وکعب الاحبار ووھب بن منبہ[۳۵] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں ابن عباس اور کعب الاحبار کے مقالہ نگاروں نے ابن عباسؓ پر اسی قسم کا الزام عاید کیا ہے[۳۶]

ان اقوال کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ان لوگوں نے یہ باتیں محض تعصب کی بنا پر کہی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ابن عباس و دیگر صحابہ کرامؓ صرف ان اہل کتاب سے روایت کرتے تھے جو اسلام لے آئے تھے اور ان کا استفسار محض ماضی کے قصص و واقعات سے متعلق ہوتا تھا اور یہ قصص و واقعات بھی بغیر پرکھے قبول نہیں کرتے تھے۔ گولڈزیہر اور احمد امین نے ان نصوص سے چشم پوشی کی ہے جن میں اسرائیلیات کی روایت کا جواز ملتا ہے اور صرف اس حدیث کو اپنے اعتراض کی دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ جس سے بظاہر اہل کتاب سے روایت کرنے سے منع کرنے کا پہلو نکلتا ہے لیکن اس نہی والی حدیث کو اگر اس وقت کے حالات کے پس منظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہی صرف اس وقت کے خصوصی حالات کی وجہ سے تھی۔ علماء نے اس حدیث کی تصریح میں مختلف اقوال پیش کئے ہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے اہل کتاب کی صرف غلط اور جھوٹی باتوں کی روایت سے منع فرمایا۔ لیکن جہاں تک صحیح اُمور کا تعلق ہے اُن کی روایت میں کوئی حرج نہیں[۳۷]۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں : وکأن النھی وقع قبل استقرار الاحکام الاسلامیۃ والقواعد الدینیۃ خشیۃ الفتنۃ ثم لما زال المحظور وقع الاذن فی ذلک فی اسماع اخبار التی کانت فی زمانھم من الاعتبار[۳۸]۔

ابن حجر ایک اور جگہ فرماتے ہیں" کہ اہل کتاب سے روایت سے منع کرنے میں تنزیہی

۳۳ے فجر الاسلام ، ۲۰۱ ، ۱۶۰

۳۴ے مجلۃ المنار جز اول ۲۶ : ۶۱۵

۳۵ے اضواء علی السنۃ المحمدیۃ ۱۴۷ ، ۱۶۴

۳۶ے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۱ : ۲۰ ، ۲ : ۵۸۲

۳۷ے فتح الباری۔ ۶ : ۳۸۸ ۳۸ے فتح الباری ۶ : ۳۸۸

پہلو تھا تحریمی نہیں۔[۳۹]

علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب سے روایت کرنے سے اس لیے روکا گیا تھا کیونکہ تورات میں تحریف ہو چکی تھی اور وکان الناس حدیثی عہد بکفر، فلو فتح باب المراجعۃ الی التوراۃ و مطالعتہا فی ذلک الزمان لأدی الی فساد عظیم[۴۰]

ان اقوال کا ماحصل یہ ہے کہ اہل کتاب سے روایت کرنے میں چند امور مانع تھے سو اگر وہ موانع ختم ہو جائیں یا وہ شخص جو علم دین پر گہری نظر رکھتا ہو اس کے لیے اسرائیلیات کی طرف رجوع کرنے میں کوئی قباحت نہیں لہذا عبداللہ بن عباس جن کی علمی فضیلت اور دینی بصیرت پر گذشتہ صفحات میں طائرانہ سی نظر ڈالی گئی ہے۔ اگر وہ بعض واقعات میں اسرائیلیات کی طرف رجوع کرتے تھے تو اس سے کسی فساد یا شریعت میں کسی خلل کا اندیشہ محض ذہنی اپج کے نتیجہ کے سوا کچھ نہیں۔ سو ان پر اسرائیلیات کے ذکر کی وجہ سے طعن کرنا جبکہ وہ تمام روایات کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھ کر قبول کرتے تھے۔ کسی سلیم الفکر اور صحیح العقیدہ مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔ جیسا کہ محمد ابوزھو فرماتے ہیں : ولا ینبغی أن یجعل من تلقی الاسرائیلیات علی ھذا الوجہ ذریعۃ للطعن فی صحابۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لانھم کانوا یزنونھا بالمیزان الشرعی وکان ذلک منھم بعد استقراء اصول الشریعۃ وکان ما یرووتہ من ذلک مما یتعلق بالأخبار والقصص لا بالعقائد والاحکام فلم تکن روایۃ ھذہ الاخبار بالتی تزلزل عقائدھم أو تشوش أفکارھم اور پھر یہ اہل کتاب مسلمان بھی صحیح العقیدہ تھے لہذا ان رواۃ پر بھی طعن مناسب نہیں۔ نیز ولیس أمثال ابن مسعود وابن عباس .... بالقاصرین عن تمییز الخبیث من الطیب[۴۱]

کم و بیش یہی بات علامہ زاہد بھی فرماتے ہیں، وہ کہتے ہیں : الروایات الاسرائیلیۃ ان صدقھا الشارع فھی مقبولۃ یقیناً وان کذبھا فھی مردودۃ یقیناً وان کان الشارع ساکتاً عن التصدیق والتکذیب بھا فنسکت عنھا فلا نصدق ولا نکذب وھذا منھج سدید لانخشی منہ غائلۃ الاسرائیلیات لأن

[۳۹] فتح الباری ۱۳ : ۴۵۰

[۴۰] روح المعانی، ۲۰ : ۸۴

[۴۱] الحدیث والمحدثون، ۱۸۶-۱۸۷

من ذكرها إنما ذكرها على انها اسرائيليات خاضعة لذلك المعيار الصادق فاذن لاكعب ولا غيره من رواة الاسرائيليات اشترها ولا يستطيعون ان يؤثروا على أفكار الاسلامية وماشرعه من احكام اصلا مادامت رواياتهم تعرض على ذلك المحك الدقيق[۲۴۱] ڈاکٹر مصطفی جوینی اسرائیلیات میں ابن عباس کا موقف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ان موقفه من الكتابيين كان موقف الناقد المعتز بدينه الذي ينخل ماينتقل اليه[۲۴۲]

بلاشبہ بعد میں آنے والے بعض مفسرین نے بعض غلط اور عجیب و غریب واقعات کو اپنی تفسیر میں بغیر نقد و تبصرہ کے بیان کر دیا ہے لہٰذا ایسے واقعات کی صحت کو پرکھنے کے لیے لازم ہے کہ سند کی صحت کو پرکھا جائے اور مضمون کو شریعت کی کسوٹی پر پیش کیا جائے۔

<u>رواۃ و تلامذہ ابن عباس</u>:- ابن عباسؓ کے تلامذہ کثیر ہیں۔ تفسیر کے ضمن میں ابن عباس کی روایات بے شمار ہیں اور ان کے طرق مختلف ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ قرآن کی ایک آیت کی تفسیر کے ضمن میں ایک سے زیادہ اقوال ملتے ہیں جو باہم متضاد و متناقض ہوتے ہیں۔ چنانچہ روایات کی شبہ کی حد تک کثرت نے ناقدینِ حدیث کو رواۃ کی چھان بین پر ابھارا سو انہوں نے جرح و تعدیل اور پوری تحقیق و جستجو کے بعد بعض رواۃ کو ثقہ و مستند اور بعض کو ضعیف اور غیر ثقہ قرار دیا۔ علماء کی اس جرح اور کاوش کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ابن عباس کی طرف بہت زیادہ احادیث وضع کر کے منسوب کی گئیں۔

ابن عباس کے مشہور طرق میں عمدہ اور صحیح ترین طریق معاویہ بن صالح عن علی ابن طلحہ کا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے اس تفسیری نسخہ کی تعریف کی ہے جسے معاویہ بن صالح اور علی بن ابی طلحہ نے روایت کیا تھا[۲۴۳]۔ بعض اور طرق بھی احسن اور عمدہ ہیں جبکہ بعض طرق محلِ نظر ہیں اور بعض سلسلۂ روایت تو کذب اور جھوٹ کا ایک سلسلہ ہے۔

جہاں تک تابعین اور تلامذۂ مفسرین مثلاً سعید بن جبیرؒ، مجاہد، عکرمہؒ، عطا بن ابی رباح کا تعلق ہے۔ علماء نے ان کی روایات کو قبول کیا ہے اور اُن کی وسعتِ علمی اور

[۲۴۱] مقالات الکوثری، ۳۴

[۲۴۲] منہج الزمخشری فی تفسیر القرآن، ۱۲

[۲۴۳] الاتقان ۲ : ۱۸۸

صدق و عدالت کو سراہا ہے۔ حتیٰ کہ امام بخاریؒ اور امام شافعیؒ جن کی قبول روایت کے لیے بڑی کڑی شرائط ہیں، ان کی تفسیر پر اعتماد کیا ہے۔

تفسیر ابن عباسؓ: ابن عباس کی طرف تفسیر کے بارے میں ایک وافر حصہ منسوب کیا جاتا ہے۔ صحابہؓ میں سب سے زیادہ تفسیری روایات ان ہی سے مروی ہیں۔ اس کثرت روایت اور فہم و بصیرت کی بنا پر انہیں "رأس المفسرین" کا خطاب بھی دیا گیا ہے۔ ابن عباس کی طرف منسوب تفسیری روایات کو "قاموس المحیط" کے مؤلف ابوطاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی نے ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ یہ مجموعہ مصر سے متعدد بار "تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس مجموعہ کے نام کے بارے میں اختلاف ہے۔ براکلمن نے اسے "تنویر المقباس" لکھا ہے جبکہ سرکیس اسے "تنویر المقیاس" کہتے ہیں۔ اگر مقیاس اور مقباس کے معانی پر غور کیا جائے تو براکلمن کے الفاظ زیادہ صائب نظر آتے ہیں کیونکہ تنویر کے ساتھ لغوی طور پر مقباس ہی زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔

اس تفسیری مجموعے میں بیشتر روایات ناقابل قبول طرق سے مروی ہیں، اسی لیے امام شافعیؒ نے فرمایا: لم یثبت عن ابن عباس الا شبیہ بمائۃ حدیث۔ اس کے علاوہ ان روایات میں باہم تضاد بھی پایا جاتا ہے، جس سے امام شافعیؒ کے اس قول میں وزن نظر آتا ہے۔ مثلاً ابن جریر نے اپنی تفسیر میں "ذبیح" کی تعیین میں ابن عباس سے تین مختلف طرق سے تین روایات بیان کی ہیں جن میں سے دو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ذبیح حضرت اسحاقؑ تھے۔ تیسری روایت ان دونوں کی مخالفت کرتی ہے .... ابن عباس قال المعنی اسماعیل وزعمت الیہود أنہ اسحٰق وکذبت الیہود۔ ابن جریر اس روایت کو اوثق مانتے ہیں۔

کتب تفسیر میں بے شمار ایسی تفسیری روایات ہیں جو وضع کی تائید کرتی ہیں۔ ان مفسرین نے بغیر نقد و تبصرہ اور بعض وقت بغیر سند کے ذکر کے ان تمام باہم متناقض اور متضاد روایات کو بیان کر کے ایک عام انسان کے لیے شکوک و شبہات کا دروازہ کھول دیا ہے۔

ابن عباس کا تفسیر میں مقام نہایت ارفع ہے لہٰذا ان جیسے عظیم صحابی اور باکمال عالم دین سے

---

۴۵ تاریخ ادبیات عربی، تکملہ، ۲: ۲۳۵

۴۶ معجم المطبوعات ۴۷ مناہل العرفان، ۱: ۴۸۵

متضاد روایات کا صادر ہونا ان کی شان اور جلالتِ علمی کے خلاف ہے۔

وما توفیقی الا باللہ

مَراجِعُ

القرآن

- صحیح بخاری : مکتبہ مصطفیٰ البابی الحلبی ، ۱۳۷۲ھ۔
- فتح الباری : ابن حجر عسقلانی، مطبعۃ البہیہ مصر ۱۳۴۸ھ۔
- المستدرک : حاکم نیشاپوری، مطبوعہ حیدرآباد دکن۔
- مجمع الزوائد و منبع الفوائد : نورالدین علی بن ابی بکر الہیثمی، مکتبہ قدس قاہرہ ۱۳۵۳ھ۔
- الاصابہ فی تمییز الصحابہ : ابن حجر عسقلانی، مطبعہ مصطفیٰ محمد مصر۔
- الاستیعاب (مع الاصابہ) : ابن عبدالبر، مطبعہ مصطفیٰ محمد مصر
- جامع بیان العلم وفضلہ : ابن عبدالبر، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ۔
- طبقات ابن سعد : ابن سعد، بیروت ۱۹۵۷ء۔
- اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ : ابن اثیر، المطبعۃ الاسلامیہ طہران۔
- تہذیب التہذیب : ابن حجر عسقلانی، حیدرآباد دکن۔
- الاتقان فی علوم القرآن : جلال الدین سیوطیؒ مطبعہ مصطفیٰ الحلبی
- الموافقات : علامہ شاطبی، مطبعۃ المکتبۃ التجاریۃ۔
- مذاہب التفسیر اسلامی : گولڈزیہر، مکتبہ خانجی مصر۔
- فجر الاسلام : احمد امین، مکتبۃ النہضۃ المصریۃ ۱۹۶۴ء۔
- اضواء علی السنۃ المحمدیۃ : محمود ابوریّہ، دار المعارف مصر طبعہ ثالثہ
- الحدیث والمحدثون : محمد ابوزہو، مطبعۃ مصر ۱۹۵۸ء
- مقالات الکوثری : محمد زاہد الکوثری، قاہرہ ۱۳۷۱ھ

روحِ انتخاب

رسولؐ کا طریقِ انقلاب

سیّد قطب شہید
مترجم خلیل حامدی

قرآنِ کریم کا وہ حصّہ جو مکّی سورتوں پر مشتمل ہے، پورے ۱۳ سال تک رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوتا رہا۔ اس پوری مدّت میں قرآن کا مدارِ بحث صرف ایک مسئلہ رہا۔ اس کی نوعیّت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی، مگر اُسے پیش کرنے کا انداز برابر بدلتا رہا قرآن نے اُسے پیش کرنے میں ہر مرتبہ نیا اسلوب اور نیا پیرایہ اختیار کیا اور ہر مرتبہ یوں محسوس ہوا کہ گویا اسے پہلی بار ہی چھیڑا گیا ہے۔ قرآنِ کریم پورے مکّی دَور میں اسی مسئلہ کے حل میں لگا رہا۔ اُس کی نگاہ میں یہ مسئلہ اس نئے دین کے تمام مسائل میں اوّلین اہمیّت کا حامل تھا، عظیم تر مسئلہ تھا، اساسی اور اصولی مسئلہ تھا، عقیدہ کا مسئلہ تھا۔ یہ مسئلہ دو عظیم نظریوں پر مشتمل تھا۔ ایک اللہ تعالیٰ کی اُلوہیّت اور انسان کی عُبودیّت اور دوسرے ان کے باہمی تعلّق کی نوعیّت۔ قرآنِ کریم اسی بنیادی مسئلہ کو لے کر انسان سے بحیثیّتِ انسان خطاب کرتا رہا۔ کیونکہ یہ مسئلہ ایسا تھا کہ اُس سے تمام انسانوں کا یکساں تعلّق ہے۔ وہ چاہے عرب کے رہنے والے انسان ہوں یا غیر عرب، نزولِ قرآن کے زمانہ کے لوگ ہوں یا کسی بعد کے زمانہ کے۔ یہ وہ انسانی مسئلہ ہے جس میں کسی ترمیم و تغیّر کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ اس کائنات میں انسان کے وجود و بقا کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کی بنیاد پر یہ طے ہوگا کہ انسان کا اس کائنات کے اندر کیا مقام ہے؟ اور اس کائنات میں بسنے والی دوسری مخلوقات کے ساتھ اُس کا کیا تعلّق ہے؟ اور خود کائنات اور موجودات کے خالق کے ساتھ اس کا کیا رشتہ ہے؟ یہ وہ پہلو ہے جس کی وجہ سے اس مسئلے میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ یہ اس کائنات اور کائنات کے ایک حقیر جزء انسان کے ساتھ براہِ راست تعلّق رکھتا ہے

بنیادی مسئلہ مکّی زندگی میں قرآن انسان کو یہ بتاتا رہا کہ اس کے اپنے وجود اور اُس کے

اور گرد پھیلی ہوئی کائنات کی اصل حقیقت کیا ہے؟ وہ انسان کو یہ بتاتا ہے کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے اور کس غرض کے لیے آیا ہے؟ اور آخر کار وہ کہاں جائے گا؟ وہ معدوم تھا اُسے کس نے خلعتِ وجود بخشا؟ کون سی ہستی اس کا خاتمہ کرے گی؟ اور خاتمہ کے بعد اسے کس انجام سے دوچار ہونا ہوگا؟ وہ انسان کو یہ بھی بتاتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے جسے وہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے لیکن دیکھ نہیں پاتا؟ اس طلسماتی کائنات کو کس نے وجود بخشا اور کون اس کا منتظم و مُدبّر ہے؟ کون اسے گردش دے رہا ہے؟ کون اسے بار بار نیا پیراہن بخشتا ہے؟ کس کے ہاتھ میں ان تغیرات کا سر رشتہ ہے، جن کا ہر چشم بینا مشاہدہ کر رہی ہے؟ وہ اسے یہ بھی سکھاتا ہے کہ خالقِ کائنات کے ساتھ اس کا رویّہ کیسا ہونا چاہیئے؟ اور خود کائنات کے بارے میں اسے کیا روش اختیار کرنی چاہیئے؟ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ انسانوں کے باہمی تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔

یہ ہے وہ اصل اور بنیادی مسئلہ جس پر انسان کی بقا اور وجود کا دار و مدار ہے اور رہتی دنیا تک اسی عظیم مسئلہ پر انسان کی بقا اور وجود کا انحصار رہے گا۔ اس اہم مسئلے کی تحقیق و توضیح میں مکّی زندگی کا پورا تیرہ سالہ دور صرف ہوا۔ اس لیے کہ انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ یہی ہے، اور اس کے بعد جتنے مسائل ہیں وہ اسی کے تقاضے میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت اس کی تفصیلات اور جزئیات سے زیادہ کچھ نہیں۔

قرآن نے مکّی دور میں اسی بنیادی مسئلے کو اپنی دعوت کا مدار بنائے رکھا اور اس سے صرفِ نظر کر کے نظامِ حیات سے متعلّق فروعی اور ضمنی بحثوں سے تعرّض نہیں کیا اور اُس وقت تک انھیں نہیں چھیڑا جب تک علمِ الٰہی نے یہ فیصلہ نہیں فرما دیا کہ اب اس مسئلہ کی توضیح و تشریح کا حق ادا ہو چکا ہے اور یہ اس انتخابِ روزگار جماعت کے دلوں میں پوری طرح جاگزیں ہو چکا ہے جسے قدرتِ الٰہی اقامتِ دین کا ذریعہ بنا کر اس کے ہاتھوں اس دین کو عملی شکل میں برپا کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

جو لوگ دینِ حق کی دعوت لے کر اُٹھتے ہیں اور وہ دنیا کے اندر ایک ایسا نظام برپا کرنا چاہتے ہیں جو بالفعل اس دین کی نمائندگی کرے انھیں اس عظیم حقیقت پر پورا غور کرنا چاہیئے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے راسخ کرنے کے لیے قرآن کریم نے مکّی زندگی کے

پورے ۱۳ سال صرف کیے، اور اس دوران میں کبھی اس سے توجہ ہٹا کر نظامِ زندگی کی دوسری تفصیلات کو نہیں چھیڑا، نہ ان قوانین و احکام کو بیان کرنے کی حاجت محسوس کی جو آگے چل کر مسلم معاشرے میں نافذ ہونے والے تھے۔

کارِ رسالت کا آغاز یہ عین حکمتِ خداوندی تھی کہ آغازِ رسالت ہی میں اس اہم مسئلہ کو جو عقیدہ و ایمان کا مسئلہ ہے دعوت کا مرکز و محور بنایا جائے۔ یعنی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم راہِ حق میں پہلا قدم ہی اس دعوت سے اٹھائیں: "لوگو! گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے۔" اور پھر اسی دعوت پر اپنا تمام وقت صرف کر دیں۔ انسانوں کو ان کے حقیقی پروردگار سے آگاہ کر دیں اور انہیں صرف اسی کی بندگی کی راہ پر لگائیں۔

اگر ظاہر بین نگاہ اور محدود انسانی عقل کی روشنی میں دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ عرب اس طریقِ دعوت سے بآسانی رام ہونے والے نہیں تھے۔ عرب اپنی زبان دانی کی بدولت "اللہ" کا مفہوم اور "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کا مدّعا خوب سمجھتے تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اُلوہیّت سے مراد حاکمیتِ اعلیٰ ہے وہ اس امر سے بھی کما حقہٗ آگاہ تھے کہ الوہیت کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص گرداننے کے صاف معنی یہ ہیں کہ اقتدار پورے کا پورا کاہنوں، پروہتوں، قبائل کے سرداروں اور امراء و حکّام کے ہاتھ سے چھین کر اللہ کی طرف لوٹا دیا جائے۔ ضمیر و قلب پر، مذہبی شعائر و مناسک پر، معاملاتِ زندگی پر، مال و دولت اور عدل و قضاء، الغرض ارواح و اجسام پر ہمہ وجوہ اللہ اور صرف اللہ کا اقتدار ہو۔ وہ خوب جانتے تھے کہ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کا اعلان درحقیقت اس دنیاوی اقتدار کے خلاف ایک چیلنج ہے جس نے اُلوہیّت کی سب سے بڑی خصوصیّت (حاکمیّت) کو غصب کر رکھا ہے۔ یہ اُن تمام قوانین اور نظاموں کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے جو اس قبضۂ غاصبانہ کی بنیاد پر وضع کیے جاتے ہیں، اور ان تمام قوّتوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہے جو خانہ ساز شریعتوں کی بدولت دنیا میں کوس لمن الملک بجاتی ہیں۔ عرب اپنی زبان کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ تھے اور وہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کے حقیقی مفہوم کو پوری طرح سمجھ رہے تھے ان سے یہ امر بھی پوشیدہ نہ تھا کہ ان کے خود ساختہ نظاموں اور ان کی پیشوائی اور قیادت کے ساتھ یہ دعوت

کیا سلوک کرنا چاہتی ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اس دعوت کا یا بالفاظِ دیگر اس پیامِ انقلاب کا اس تشدّد اور غیظ و غضب کے ساتھ استقبال کیا، اور اس کے خلاف وہ معرکہ آرائی کی جس سے ہر خاص و عام واقف ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دعوت کا آغاز اس انداز سے کیوں ہوا؟ اور حکمتِ الٰہی نے کس بنا پر یہ فیصلہ کیا کہ اس دعوت کا افتتاح ہی مصیبتوں اور آزمائشوں سے ہو۔

قومیّت کا نعرہ کیوں نہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اللہ کی طرف سے دینِ حق کو لے کر مبعوث ہوئے تو اس وقت حالت یہ تھی کہ عربوں کے سب سے زیادہ شاداب و زرخیز اور مالدار علاقے عربوں کے ہاتھ میں نہیں تھے بلکہ دوسری اقوام ان پر قابض تھیں۔ شمال میں شام کے علاقے رومیوں کے زیرِ نگیں تھے، جن پر عرب حکام رومیوں کے زیرِ سایہ حکومت چلا رہے تھے۔ جنوب میں یمن کا پورا علاقہ اہلِ فارس کے قبضے میں تھا جنہوں نے اپنے ماتحت عرب شیوخ کو فرائضِ حکمرانی سونپ رکھے تھے۔ عربوں کے پاس صرف حجاز اور تہامہ اور نجد کے علاقے تھے۔ یا وہ بے آب و گیاہ صحرا تھے جن میں اِکّا دُکّا نخلستان پائے جاتے تھے۔ یہ بات بھی محتاجِ دلیل نہیں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم میں صادق اور امین کی حیثیت سے معروف تھے۔ آغازِ رسالت سے پندرہ سال قبل اشرافِ قریش حجرِ اسود کے تنازعہ میں آپ کو اپنا حکم بنا چکے تھے، اور آپ کے فیصلہ کو بخوشی مان چکے تھے۔ نسب کے لحاظ سے بھی آپؐ بنو ہاشم کے چشم و چراغ تھے جو قریش کا معزز ترین خاندان تھا۔ ان حالات و اسباب کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات پر پوری طرح قادر تھے کہ اپنے ہم وطنوں کے اندر عرب قومیّت کے جذبہ کو بھڑکاتے اور اس طرح ان قبائلِ عرب کو اپنے گرد جمع کر لیتے جنھیں باہمی جھگڑوں نے پارہ پارہ کر رکھا تھا اور کشت و خون اور انتقام در انتقام کی چکّی میں بُری طرح پِسے ہوئے تھے۔ حضورؐ اگر چاہتے تو ان سب عربوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کر کے انہیں قومیّت کا درس دیتے، اور شمال کے رومی اور جنوب کے ایرانی استعمار کے تسلّط سے عرب سرزمین کو آزاد کرانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔ عرب کے تمام اطراف و اکناف کو ملا کر متحدہ عرب ریاست کی داغ بیل ڈال دیتے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قوم پرستی کے نعرہ کو لے کر اٹھتے تو

عرب کا بچہ بچہ اس پر لبیک کہتا ہوا لپکتا، اور آپؐ کو وہ مصائب و آلام نہ سہنے پڑتے جو آپؐ کو ۱۳ سال تک صرف اس بنا پر سہنے پڑے کہ آپؐ کی دعوت اور نظریہ جزیرۃ العرب کے فرماں رواؤں کی خواہشات سے متصادم تھا۔ مزید برآں یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ جب عرب آپؐ کی قومی دعوت کو جوش و خروش کے ساتھ قبول کر چکتے، قیادت کا منصب آپ کو سونپ دیتے اور اقتدار کی ساری کنجیاں پوری طرح آپ کے قبضے میں آجاتیں، اور رفعت و عظمت کا تاج آپؐ کے مبارک سر پر رکھ دیا جاتا تو آپ اپنی اس بے پناہ طاقت اور اثر کو عقیدۂ توحید کا سکہ رواں کرنے کے لیے استعمال کرتے، اور لوگوں کو اپنے انسانی اقتدار کے سامنے سرنگوں کرنے کے بعد بالآخر لے جا کر خدا کے آگے سرنگوں کر دیتے۔ لیکن خدائے علیم و حکیم نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس راستے پر نہیں چلایا۔ بلکہ انہیں حکم دیا کہ صاف صاف اعلان کر دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور ساتھ ہی متنبہ بھی کر دیا کہ اس اعلان کے بعد آپؐ خود اور وہ مٹھی بھر افراد جو اس اعلان پر لبیک کہیں ہر قسم کی تکلیف و اذیت برداشت کرنے کے لیے بھی تیار رہیں۔

آخر کٹھن راستہ اللہ تعالیٰ نے کیوں منتخب فرمایا؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہلِ ایمان ساتھیوں کے حق میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ تشدد اور ظلم کا نشانہ بنیں۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ اس دعوت کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اور نہ یہ کوئی صحیح بات ہوتی کہ مخلوقِ خدا رومی یا ایرانی طاغوت کے پنجے سے نجات پا کر عربی طاغوت کے پنجہ میں گرفتار ہو جائے یہ ملک اللہ تعالیٰ کا ہے اور اس پر صرف اللہ ہی کا اقتدار قائم ہونا چاہیئے اور اللہ کا اقتدار صرف اس صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ اس کی فضاؤں میں صرف "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کا پرچم لہرائے۔ یہ بات کیوں کر مقبول اور درست ہو سکتی تھی کہ خدا کی زمین پر بسنے والی مخلوق رومی اور ایرانی طاغوتوں سے نجات پاتے ہی عربی طاغوت کا طوقِ غلامی اپنے گلے میں ڈال لے۔ طاغوت جس قبا میں بھی ہو وہ طاغوت ہے۔ انسان صرف خدائے واحد کے بندے اور غلام ہیں اور وہ صرف اس صورت میں بندے اور غلام رہ سکتے ہیں کہ ان کی زندگیوں میں صرف اللہ کی اُلوہیت کا بول بالا ہو۔ ایک عرب "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کا لغوی لحاظ

سے جو مفہوم سمجھا تھا وہ یہ تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو، اللہ کے سوا کوئی اور ہستی قانون اور شریعت کا منبع و ماخذ نہ ہو، اور انسان کا انسان پر غلبہ و اقتدار باقی نہ رہے کیونکہ اقتدار بہمہ وجوہ اللہ ہی کے لیے ہے، اور اسلام انسانوں کے لیے جس "قومیت" کا علم بردار ہے وہ اسی عقیدہ کی بنیاد پر طے ہوتی ہے۔ تمام اقوام خواہ وہ کسی رنگ و نسل کی ہوں، عربی ہوں یا رومی اور ایرانی، سب اس عقیدہ کی نگاہ میں پرچم الٰہی کے تحت مساویانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ قرآن کے نزدیک اسلامی دعوت کا یہی صحیح اور فطری طریق کار ہے۔

اقتصادی انقلاب کیوں نہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب معاشرہ دولت کی منصفانہ تقسیم اور عدل و انصاف کے صحت مندانہ نظام سے یکسر بیگانہ ہو چکا تھا۔ ایک قلیل گروہ تمام مال و دولت اور تجارت پر قابض تھا۔ اور سودی کاروبار کے ذریعہ اپنی تجارت اور سرمائے کو برابر بڑھاتا اور پھیلاتا جا رہا تھا اس کے مقابلے میں ملک کی غالب اکثریت مفلوک الحال اور بھوک کا شکار تھی۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں دولت تھی وہ ہی عزت و شرافت کے اجارہ دار تھے۔ رہے ہمارے عوام تو وہ جس طرح مال و دولت سے تہی دامن تھے اسی طرح عزت و شرافت سے بھی بے بہرہ تھے۔

اس صورتِ حال کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی اجتماعی تحریک کیوں نہ اٹھائی اور دعوت کا مقصد دولت کی منصفانہ تقسیم ٹھیرا کر امراء و شرفاء کے خلاف طبقاتی جنگ کیوں نہ چھیڑ دی تاکہ سرمایہ داروں سے محنت کش عوام کو ان کا حق دلوا سکتے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس دور میں ایسی کوئی اجتماعی تحریک اور دعوت لے کر اٹھتے تو عرب معاشرہ لازماً دو طبقوں میں بٹ جاتا۔ مگر غالب اکثریت آپ کی تحریک کا ساتھ دیتی اور سرمایہ و جاہ و شرف کی ستم کیشیوں کے سامنے ڈٹ جاتی اور آپ کے مقابلے میں وہ معمولی سی اقلیت ہی رہ جاتی جو اپنے پشتینی مال و جاہ سے چمٹی رہتی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہج اختیار فرماتے تو زیادہ مؤثر اور کارگر ہوتا۔ اور یہ صورت پیش نہ آتی کہ پورا معاشرہ لا الٰہ الا اللہ کے اعلان کے خلاف صف آرا ہو جائے اور صرف چند نادر روزگار ہستیاں

ہی دعوتِ حق کے افق تک پہنچ سکیں۔

کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ صلاحیت بدرجۂ کمال موجود تھی کہ جب اکثریت آپؐ کی تحریک سے وابستہ ہو کر اپنی زمامِ قیادت آپؐ کے ہاتھ میں دے دیتی۔ اور آپ دولت مند اقلیت پر قابو پا کر اس کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنا چکتے تو آپؐ اپنے اس منصب و اقتدار کو اور پوری قوت و طاقت کو اس عقیدۂ توحید کے منوانے اور اسے قائم و راسخ کرنے میں استعمال کر لیتے جس کے لیے دراصل اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا تھا۔ آپؐ انسانوں کو پہلے انسانی اقتدار کے آگے جھکا کر پھر انہیں پروردگارِ حق کے آگے جھکا دیتے۔ لیکن خدائے علیم و حکیم نے آپؐ کو اس طریقِ کار پر بھی چلنے کی اجازت نہ دی۔ خدا کو معلوم تھا کہ یہ طریقِ کار دعوتِ اسلامی کے لیے موزوں اور مناسب نہیں ہے۔ وہ جانتا تھا کہ معاشرے کے اندر حقیقی اجتماعی انصاف کے سوتے صرف ایک ایسے ہمہ گیر نظریہ کے چشمۂ صافی سے ہی پھوٹ سکتے ہیں جو معاملات کی زمامِ کار کلیتہً اللہ کے ہاتھ میں دیتا ہو اور معاشرہ ہر اس فیصلے کو برضا و رغبت قبول کرتا ہو۔ جو دولت کی منصفانہ تقسیم اور اجتماعی کفالت کے بارے میں بارگاہِ الٰہی سے صادر ہو، اور معاشرے کے ہر فرد کے دل میں، پانے والے کے دل میں بھی اور دینے والے کے دل میں بھی یہ بات پوری طرح منقش ہو کہ وہ جس نظام کو نافذ کر رہا ہے اس کا شارع اللہ تعالیٰ ہے، اور اس نظام کی اطاعت سے اُسے نہ صرف دنیا کے اندر فلاح کی اُمید ہے، بلکہ آخرت میں بھی وہ جزائے خیر پائے گا۔ معاشرے کی یہ کیفیت نہ ہو کہ کچھ انسانوں کے دل حرص و آز کے جذبات سے اُمنڈ رہے ہوں اور کچھ دوسرے انسانوں کے دل حسد و کینہ کی آگ میں جل رہے ہوں۔ معاشرے کے تمام معاملات تلوار اور ڈنڈے کے زور پر طے کیے جا رہے ہوں، تخویف اور دھونس اور تشدد کے بل پر فیصلے نافذ کیے جا رہے ہوں، انسانوں کے دل ویران اور ان کی روحیں دم توڑ رہی ہوں۔ جیسا کہ آج ان نظاموں کے تحت ہو رہا ہے جو غیر اللہ کی الوہیت پر قائم ہیں۔

اصلاحِ اخلاق کی مہم کیوں نہیں؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے وقت جزیرۃ العرب کی اخلاقی سطح ہر پہلو

سے انحطاط کے آخری کنارے تک پہنچی ہوئی تھی۔ صرف چند بدویانہ فضائلِ اخلاق خام حالت میں موجود تھے۔ ظلم اور جارحیت نے معاشرے کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ جاہلی دَور کا نامور شاعر زہیر ابن ابی سلمیٰ اسی معاشرتی فساد کی طرف اپنے اس شعر میں حکیمانہ انداز سے اشارہ کرتا ہے:

و من لم یذد عن حوضہ بسلاحہ یھدّم، و من لا یظلم الناس یظلم

"جو ہتھیار کی طاقت سے اپنا دفاع نہیں کرے گا، تباہ و برباد ہوگا۔ اور جو خود بڑھ کر لوگوں پر ظلم نہیں کرے گا وہ خود (بالآخر) ظلم کا شکار ہو جائے گا۔"

اسی خرابی کی طرف جاہلی دَور کا یہ مشہور و معروف مقولہ بھی اشارہ کرتا ہے کہ: اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا ٥ (اپنے بھائی کی مدد کر، خواہ وہ ظلم کر رہا ہو یا اُس پر ظلم ہو رہا ہو۔)[1]

شراب خوری اور جُوا بازی معاشرتی زندگی کی روایت بن چکے تھے، اور ان پر فخر کیا جاتا تھا جاہلی دَور کی تمام شاعری خمر اور قمار کے محور پر گھومتی ہے۔ طرفہ ابن العبد کہتا ہے:

فلولا ثلاث ھن من عیشۃ الفتی وجدک لم احفل متی قام عودی

"اگر تین چیزیں جو ایک نوجوان کی زندگی کا لازمہ ہیں نہ ہوتیں، تو مجھے کسی چیز کی پروا نہ رہتی بشرطیکہ مجھے تا لبِ رمق غذا ملتی رہتی۔"

فمنھن سبقی العاذلات بشربۃٍ کمیت متی ما تعل بالماء تزبد

"ان میں سے ایک میرا اپنے رقیبوں سے مے نوشی میں سبقت لے جانا ہے، اور مے بھی وہ دوآتشہ جس میں اگر پانی ملایا جائے تو اس پر کف آجائے۔"

وما زال تشرابی الخمور ولذتی وبذلی وانفاقی طریفی ومتلدی

"شراب نوشی، لذت پرستی، اور بذل و اسراف پہلے بھی میری گھٹی میں پڑے ہوئے تھے، آج بھی ہیں۔"

الی ان تحامتنی العشیرۃ کلھا وافردت افراد البعیر المعبّد

"آخر وہ دن آگیا کہ میرا پورا قبیلہ مجھ سے دُور ہٹ گیا اور مجھے الگ تھلگ کر دیا گیا، جیسے خارش زدہ اُونٹ کو گلے سے الگ کر دیتے ہیں۔"

زنا کاری مختلف شکلوں میں رائج تھی اور اس جاہلی معاشرے کی قابلِ فخر روایت بن چکی

[1] آں حضور کی ایک حدیث میں بھی یہ ٹکڑا وارد ہوا ہے۔ مگر آپؐ نے اس میں واضح کر دیا ہے کہ ظالم کی مدد سے مُراد اُسے روکنا ہے۔ (مترجم)

تھی۔ یہ ایک ایسا حمام ہے جس میں ہر دور کا جاہلی معاشرہ ننگا نظر آتا ہے خواہ وہ دورِ قدیم کا جاہلی معاشرہ ہو یا عہدِ حاضر کا (نام نہاد مہذب معاشرہ)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جاہلی معاشرے کی حالت ان الفاظ میں بیان کی ہے :-

"جاہلیت میں نکاح کی چار صورتیں تھیں : ایک تو وہ صورت تھی جو آج لوگوں میں جاری ہے۔ یعنی ایک آدمی دوسرے شخص کو اس کی بیٹی یا اس کی تولیت میں رہنے والی دوشیزہ کے لیے پیغامِ نکاح دیتا، اور اس کا مہر ادا کر کے اس سے نکاح کر لیتا۔ نکاح کی دوسری صورت یہ تھی کہ مرد اپنی بیوی سے، جبکہ وہ حیض سے پاک ہو چکی ہوتی، کہتا کہ فلاں شخص کو بُلا، اور اُس سے پیٹ رکھوا۔ چنانچہ وہ خود اس سے الگ رہتا اور اس وقت تک نہ چھُوتا جب تک اُس آدمی کے حمل کے آثار ظاہر نہ ہو جاتے۔ آثار ظاہر ہو جانے کے بعد خاوند اگر چاہتا تو اس سے ہم بستری کر لیتا۔ وہ یہ طریقہ اس لیے اختیار کرتا تاکہ اُسے اچھے نسب کا لڑکا ملے۔ نکاح کی اس شکل کو استبضاع کہا جاتا ہے۔ نکاح کی ایک تیسری صورت بھی تھی۔ مردوں کی ایک ٹولی جو دس سے کم ہوتی جمع ہو جاتی اور مل کر ایک عورت کے پاس جاتی، اور اُس سے مقاربت کرتی۔ جب اُسے حمل ٹھہر جاتا تو بچے کی ولادت پر چند راتیں گزر جانے کے بعد وہ اُن سب کو بُلا بھیجتی۔ اس طرح بُلاوا ملنے پر کوئی شخص جانے سے انکار نہ کر سکتا تھا۔ جب وہ اُس کے پاس جمع ہو جاتے، تو وہ عورت اُن سے کہتی : تمہیں اپنی کارروائی کا نتیجہ تو معلوم ہو ہی چکا ہے۔ مَیں نے ایک بچہ جنا ہے۔ پھر وہ اُن میں سے ایک کی طرف اشارہ کر کے کہتی کہ یہ تیرا بیٹا ہے۔ اِس پر بچے کا نام اُس شخص کے نام پر رکھ دیا جاتا، اور لڑکا اُس کی طرف منسوب ہو جاتا اور وہ اس نسبت سے انکار نہ کر سکتا تھا۔ نکاح کی چوتھی قسم یہ تھی کہ بہت سے لوگ جمع ہو جاتے اور مل کر ایک عورت کے پاس جاتے، جس کے پاس جانے میں کسی کو کوئی رکاوٹ نہ ہوتی تھی۔ دراصل یہ پیشہ ور فاحشہ عورتیں تھیں اور علامت کے طور پر اپنے دروازوں پر جھنڈے نصب کر لیتیں۔ جو شخص بھی اپنی حاجت پوری کرنا چاہتا، اُن کے پاس چلا جاتا۔ ایسی عورتوں میں سے اگر کسی کو حمل ٹھہر جاتا تو وہ وضعِ حمل کے بعد سارے لوگ اُس کے پاس اکٹھے ہو جاتے، اور ایک قیافہ شناس کو بُلا لیتے۔ وہ اُن میں سے

جس کی طرف اس لڑکے کو منسوب کرتا وہ لڑکا اس شخص کا قرار پاتا اور وہ اس سے انکار نہ کر سکتا۔" (بخاری کتاب النکاح)

سوال کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو ایک اصلاحی تنظیم کے قیام کا اعلان کر کے اس کے ذریعہ اصلاح اخلاق، تزکیۂ نفوس اور تطہیر معاشرہ کا کام شروع کر دیتے۔ کیونکہ جس طرح ہر مصلح اخلاق کو اپنے ماحول کے اندر چند پاکیزہ اور سلیم الفطرت نفوس ملتے رہے ہیں اسی طرح آپؐ کو بھی ایک ایسا پاک سرشت گروہ بالیقین دستیاب ہو جاتا جو اپنے ہم جنسوں کے اخلاقی انحطاط اور زوال پر دلی دکھ محسوس کرتا۔ یہ گروہ اپنی سلامتیٔ فطرت اور نفاستِ طبع کے پیشِ نظر آپؐ کی دعوتِ تطہیر و اصلاح پر لازماً لبیک کہتا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کام کا بیڑا اُٹھاتے تو بڑی آسانی سے اچھے انسانوں کی ایک جماعت کی تنظیم میں کامیاب ہو جاتے۔ یہ جماعت اپنی اخلاقی طہارت اور روحانی پاکیزگی کی وجہ سے دوسرے انسانوں سے بڑھ کر عقیدۂ توحید کو قبول کرنے اور اُس کی گراں بار ذمہ داریوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہوتی۔ اور اس حکیمانہ آغاز سے آپ کی یہ دعوت کہ الوہیت صرف خدا کے لیے مخصوص ہے، پہلے ہی مرحلہ میں تند و تیز مخالفت سے دوچار نہ ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ راستہ بھی منزلِ مقصود کو نہیں جاتا۔ اُسے معلوم تھا کہ اخلاق کی تعمیر صرف عقیدہ کی بنیاد پر ہی ہو سکتی ہے۔ ایک ایسا عقیدہ جو ایک طرف اخلاقی اقدار اور معیار رد و قبول فراہم کرے اور دوسری طرف اس "طاقت" (ENERGY) کا تعین بھی کرے جس سے یہ اقدار و معیار ماخوذ ہوں، اور انہیں سند کا درجہ حاصل ہو۔ اور اُس جزا و سزا کی نشان دہی بھی کرے جو ان اقدار و معیارات کی پابندی یا اُن کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اُس "طاقت" کی طرف سے دی جائے گی۔ دلوں پر اس نوعیت کے عقیدہ کی ترسیم اور بالاتر قوت کے تصوّر کے بغیر اقدار و معیارات خواہ کتنے ہی بلند پایہ ہوں مسلسل تغیر کا نشانہ بنے رہیں گے اور ان کی بنیاد پر جو بھی اخلاقی نظام قائم ہوگا وہ ڈانواں ڈول رہے گا۔ اُس کے پاس کوئی ضابطہ نہ ہوگا، کوئی نگران اور محتسب طاقت نہ ہوگی، کیونکہ دل جزا و سزا کے کسی لالچ یا خوف سے بالکل خالی ہوں گے۔

ہمہ گیر انقلاب صبر آزما کوششوں سے جب عقیدۂ الوہیت دلوں میں راسخ ہو گیا۔

اور اس "طاقت" کا تصور بھی دلوں میں اتر گیا جس سے اس عقیدہ کو سند حاصل ہوتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں جب انسانوں نے اپنے رب کو پہچان لیا اور صرف اُسی کی بندگی کرنے لگے، جب انسان خواہشاتِ نفس کی غلامی سے، اور اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی آقائی سے آزاد ہو گئے اور "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کا نقش دلوں میں پوری طرح مُرتسم ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس عقیدہ کے ماننے والوں کے ذریعہ وہ سب کچھ فراہم کر دیا جو وہ تصور کر سکتے تھے۔ خدا کی زمین رومی اور ایرانی سامراج سے پاک ہو گئی، لیکن اس تطہیر کا مدعا یہ نہیں تھا کہ اب زمین پر عربوں کا سکہ رواں ہو بلکہ اس لیے کہ اللہ کا بول بالا ہو چنانچہ زمینِ خدا کے سب باغیوں سے، خواہ وہ رومی تھے یا ایرانی اور عربی، پاک کر دی گئی۔

نیا اسلامی معاشرہ اجتماعی ظلم اور لوٹ کھسوٹ سے بالکل پاک تھا۔ یہ اسلامی نظام تھا اور اس میں عدلِ الٰہی پوری طرح جلوہ گر تھا۔ یہاں صرف میزانِ الٰہی میں ہر خوبی و زشت اور صحیح و غلط کو تولا جاتا تھا۔ اِس عدلِ اجتماعی کی بنیاد توحید تھی اور اس کا اصطلاحی نام "اسلام" تھا۔ اس کے ساتھ کسی اور نام یا اصطلاح کا اضافہ کبھی گوارا نہیں کیا گیا۔ اس پر صرف یہ عبارت کندہ تھی: "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ!"

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے!

نفوس اور اخلاق میں نکھار آ گیا۔ قلوب و ارواح کا تزکیہ ہو گیا اور یہ اصلاح اس انداز سے ہوئی کہ چند مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ کر ان حدود و تعزیرات کے استعمال کی نوبت ہی نہ آئی، جن کو اللہ تعالیٰ نے قائم فرمایا تھا۔ اس لیے کہ اب ضمیروں کے اندر پولیس کی چوکیاں قائم ہو گئیں۔ اب خدا کی خوشنودی کی طلب، اجر کی خواہش، خدا کے غضب اور عذاب کا خوف محتسب کا فرض انجام دے رہا تھا۔ الغرض انسانی نظامِ انسانی اخلاق، اور انسانی زندگی کمال کی اُس بلندی تک پہنچ گئی جس تک نہ پہلے پہنچی، اور نہ صدرِ اوّل کے بعد آج تک پہنچ سکی ہے۔

یہ انقلابِ عظیم کیسے برپا ہوا؟ یہ انقلابِ عظیم اور کمالِ انسانیت صرف اس بنا پر حاصل ہوا کہ جن لوگوں نے دینِ حق کو ایک ریاست، ایک نظام اور جامع قانون و شریعت کی شکل میں قائم کیا تھا، وہ خود پہلے اسے اپنے قلب و ضمیر اور اپنی زندگی میں قائم کر چکے تھے۔ اسے عقیدہ و فکر کے طور پر تسلیم کر چکے تھے۔ اپنے

اخلاق کو اس سے آراستہ و پیراستہ کر چکے تھے، اپنی عبادات میں اُسے سند دے چکے تھے اور اپنے معاملات میں اس کا سکہ رواں کر چکے تھے۔ اُس دین کے قیام پر اُن سے صرف ایک ہی وعدہ کیا گیا تھا۔ اس وعدہ میں غلبہ و اقتدار عطا کر دینے کا کوئی جز شامل نہیں تھا۔ حتیٰ کہ یہ جُز بھی شامل نہیں تھا کہ یہ دین لازماً انہی کے ہاتھوں غالب ہو گا۔ اُن سے جو کچھ کہا گیا وہ صرف اتنا تھا کہ اقامتِ دین کے عوض انہیں جنّت ملے گی جو صبر آزما جہاد ان لوگوں نے کیا جو زہرہ گداز آزمائشیں انہوں نے سہیں، جس پامردی و استقامت کے ساتھ وہ راہِ دعوت پر رواں دواں رہے، اور پھر بالآخر جس طرح انہوں نے جاہلیت کے مقابلے میں اس حقیقتِ کبریٰ کا ساتھ دیا جو "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کے اندر پنہاں ہے اور جو ہر زمان و مکان کے فرماں رواؤں کے لیے ناگوار رہی ہے۔ ان سب خدمات کے عوض ان سے صرف ایک وعدہ کیا گیا جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، یعنی فقط وعدۂ فردا۔

جب اللہ تعالیٰ نے انھیں آزمائش کی بھٹی میں ڈالا اور وہ ثابت قدم رہے اور ہر نفسانی خواہش اور حظ سے دست بردار ہو گئے، اور جب اللہ تعالیٰ نے جان لیا کہ وہ اس دنیا کے اندر اب کسی طور جزا اور صلہ کے منتظر نہیں ہیں۔ نہ انہیں اس کا انتظار ہے کہ یہ دعوت لازماً اُن ہی کے ہاتھوں غلبہ حاصل کرے، اور یہ دین ان ہی کی قربانیوں اور کوششوں سے بالا و برتر ہو۔ ان کے دلوں میں نہ آبا و اجداد کا تفاخر باقی رہا، نہ قومی گھمنڈ کے جراثیم، نہ وطن و ملک کی بڑائی کا جذبہ رہا اور نہ قبائلی اور نسبی عصبیتوں کی بُو رہی۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے انہیں ان خوبیوں سے آراستہ دیکھا تب جا کر اُن کے حق میں یہ فیصلہ دیا کہ یہ لوگ اب "امانتِ عظمیٰ" (یعنی خلافتِ ارضی) کے بار کو اُٹھا سکتے ہیں۔ یہ اس عقیدے میں کھرے ہیں جس کا تقاضا ہے کہ ہر طرح کی حاکمیت صرف خدائے واحد کے لیے مخصوص ہو، دل و ضمیر پر، اخلاق و عبادات پر، جان و مال پر، اور حالات ظروف پر صرف اُسی کی حاکمیت ہو۔ خدا کو معلوم تھا کہ یہ اس سیاسی اقتدار کے سچے محافظ ثابت ہوں گے۔ جو ان کے ہاتھوں میں اس غرض کے لیے دیا جائے گا۔ تاکہ شریعتِ الٰہی کو نافذ کریں اور عدلِ الٰہی کو قائم کریں۔ مگر اس اقتدار میں سے ان کی اپنی ذات کے لیے یا اپنے قبیلے اور برادری کے لیے یا اپنی قوم کیلئے کوئی حصّہ نہ ہو۔ بلکہ وہ سراسر اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہو اور اللہ کے دین اور اس کی

شریعت کی خدمت کے لیے ہو۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اس اقتدار کا منبع صرف اللہ ہے اور اُسی نے ان کی تحویل میں دیا ہے۔

اگر دعوتِ اسلامی کا قافلہ اس انداز سے روانۂ سفر نہ ہوتا، اور دوسرے تمام جھنڈوں کو پھینک کر صرف اسی جھنڈے یعنی "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کے پرچم توحید کو بلند نہ کرتا، اور اس راہ کو اختیار نہ کرتا جو ظاہر میں دشوار گزار اور جان گسل راہ تھی مگر حقیقت میں آسان اور بابرکت بداماں تھی تو اس مبارک اور پاکیزہ نظام کا کوئی جز بھی اتنے بلند معیار کے ساتھ ہرگز بروئے عمل نہ آسکتا تھا۔ اسی طرح اگر یہ دعوت اپنے ابتدائی مراحل میں قومی نعرہ بن کر سامنے آتی۔ یا اقتصادی تحریک کے لبادہ میں ظاہر ہوتی، یا اصلاحی مہم کا قالب اختیار کرتی یا "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے شعار اور نعرے بھی شامل کر لیتی تو یہ پاکیزہ و مبارک نظام جو اس دعوت کے نتیجے میں قائم ہوا، کبھی خالص ربانی نظام بن کر جلوہ گر نہ ہو سکتا۔ (ماخوذ از سیارہ ڈائجسٹ رسول نمبر)

(بقیہ خطوط و آرا)

ص ۶

مکتوب از جناب حکیم محمد سعید صاحب صدر نیشنل فاؤنڈیشن پاکستان۔ کراچی ۱۸۔

جناب محترم ڈاکٹر صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

۱۲ ربیع الاوّل (۳ مارچ ۱۹۷۷ء) کو شام ہمدرد لاہور میں آپ کا مقالہ "انقلاب نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا اساسی منہاج" بلاشبہ ایک اہم ترین موضوع تھا اور آپ نے اس موضوع پر جس محاکمہ کے ساتھ خطاب فرمایا ہے۔ میں اس پر آپ کی خدمت میں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور بصمیم قلب آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کے مراتب بلند تر فرمائے۔

خطوط و آرا

مکتوب از جناب مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان، لکھنؤ (بھارت)

محب مکرم و محترم جناب ڈاکٹر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

بہت مدت کے بعد، شاید برسوں کے بعد عریضہ لکھ رہا ہوں۔ اس طویل مدت میں آپ کی طرف سے بھی کوئی مکتوب نہیں آیا۔ اب خط و کتابت مشکل بھی بہت ہوگئی ہے۔

جب سے خطوط اور رسائل کی آمد و رفت شروع ہوئی، اور رسالے تو آرہے تھے "میثاق" نہیں آرہا تھا۔ مئی میں اک شمارہ آیا، اس سے آپ کے موجودہ کام کی اچھی خاصی تفصیل معلوم ہوگئی اور وہاں سیاست کے میدان میں جو کچھ ہورہا ہے اس کے بارے میں آپ کا موقف بھی معلوم ہوگیا لیکن ایسے ہنگاموں کے وقت میں خالص عقل کی باتیں کوئی نہیں سنا کرتا۔ حالانکہ حقیقت دو اور دو چار کی طرح وہی ہے جو آپ نے سمجھی ہے۔ دعا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ خیر پیدا فرمائے، اُس کی قدرت میں سب کچھ ہے۔

دو مکتوب از ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ایبٹ آباد

مکرمی و محترمی جناب ڈاکٹر صاحب، السلام علیکم

آج پھر شوقِ مکالمت نے آپ کی سمع خراشی کے لیے مجبور کردیا۔ میثاق کی باقاعدہ اشاعت سے بہت خوشی ہوئی۔ وقت پر اس کا پہنچ جانا، مشتاقانِ زیارت کے لیے باعثِ اطمینان ہے۔

حضرت عثمانؓ ذو النورین پر آپ کا مضمون دلائل کے لحاظ سے مُسکت، بیان کی رُو سے علم افزا اور تاثیر کے لحاظ سے فکر انگیز ہے۔

آپ کے ارشادات میں خاص اثر ہے۔ جو آپ کی بصیرتِ علمی اور اخلاص فی النیت والعمل کا آئینہ دار ہے۔ آپ کی تحریر و تقریر میں ایک خاص علمی چاشنی اور حکمت کی آمیزش ہوتی ہے اور یہ خدا کا فضل ہے ـــــ جانے بُوجھے اور کئی دفعہ کے پڑھے ہوئے واقعات کی تفسیر آپ کی زبان سے اتنی مؤثر اور معلومات افزا ہوتی ہے کہ دل و دماغ میں اُتر

جاتی ہے اور "ذوالنورین" پر آپ کا مقالہ اس علمی بصیرت کا تازہ شاہکار ہے۔ جس کی داد کے لیے یہ عریضہ تحریر کر رہا ہوں۔

"تدبرِ قرآن" حسب معمول زیرِ تلاوت رہتا ہے اور اس سے ظرلوتِ قلب و رُوح کا سامان مہیا کرتا رہتا ہوں (شیر بہادر خاں پنّی)

۲ - محترمی و مکرمی! السلام علیکم

اب میں عمر کی اس منزل میں ہوں کہ خواہشاتِ نفس ختم ہو چکی ہیں۔ دنیا کے کاموں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔ عمر بھر کتبِ مذہبی، تاریخی و علمی کے مطالعہ اور ان کے جمع کرنے کا شوق رہا۔ اب میری اولاد میں اس جنس کا کوئی خریدار نہیں۔ لہٰذا یہ چاہتا ہوں کہ اپنی سب کتب کسی ایسے علمی ادارے کو دے دوں جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں اور میرے لیے دعاءِ خیر کریں۔ لہٰذا اب خیال ہے کہ اب ہی یہ کتب آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ میری زندگی کی عزیز ترین متاع یہی ہے اور آپ سے زیادہ عزیز اس بارے میں مجھے کوئی اور نہیں۔ لہٰذا اپنے ہاتھ سے ہی آپ کو پیش کر دوں۔

نوٹ

صاحبِ مکتوب علم دوست اور صاحبِ ذوق بزرگ و معمّر شخصیت ہیں۔ بہت سے اکابر علماء اور سیاسی راہنماؤں کی صحبت اٹھائی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کے والہ اور شیفتہ ہیں۔ مولانا مرحوم سے براہِ راست ملاقاتی اور فیض یاب بھی ہوئے ہیں۔ موصوف سے ملاقات کے لیے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ۲۰ جون کو ایبٹ آباد تشریف لے گئے تھے راقم الحروف بھی ساتھ تھا۔ ڈاکٹر شیر بہادر خاں صاحب نے اپنے کتب خانے کی بے شمار قیمتی و نایاب کتابیں مرکزی انجمن کی لائبریری کے لیے ہدیہ فرمائی ہیں۔ کوشش کی جائے گی کہ کتب کی مکمل فہرست آئندہ کسی شمارے میں شائع کی جائے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے ذوق کی تسکین کے لیے کتب کی صورت میں جو قیمتی سرمایہ جمع کیا تھا وہ استفادۂ عام کے لیے مرکزی انجمن کے لیے وقف فرما کر ایک لائقِ تقلید مثال قائم کی ہے۔ جزاھم اللہ خیراً۔ (ج-ر)

کیمپ جیل لاہور سے دو مکتوب از چودھری رشید احمد صاحب آف مکتبہ جدید پریس لاہور

۱- عالی قدر السیّد اسرار احمد صاحب مدّ ظلہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' !

'میثاق' شمارہ اپریل آج ہی مجھے ملا اور "شہید مظلوم" کی آخری قسط پڑھی۔ اس سے پہلے ایک شمارہ مجھے بہت یاد ہے جو "اسلامی تصوف" پر جناب پروفیسر حضرت محمد یوسف سلیم چشتی مدّ ظلہٗ کا ترتیب دیا ہوا تھا (سبحان اللہ) وہ یہاں جیل میں بھی بہت دوستوں کی نظر سے گزرا۔ وہ شمارہ بہت قیمتی تھا۔ وہ ہر خواندہ کے لیے مطالعہ کا پُرکشش باعث نہ بن سکا۔ البتہ وہ ایک ایسی تحریر تھی کہ جس نے اُسے پڑھا کم از کم دو بار ضرور پڑھا اور پھر اس پر کئی کئی موقعوں پر گفتگو ہوتی رہی۔

محترم! اصل بات تو یہ تھی کہ "شہید مظلوم" کے بارے میں اس کو جس ترتیب اور حسن سے آپ نے مرتّب فرمایا (اللہ تعالیٰ مجھے خوشامد سے بچائے۔ آمین!) اتنا پُر اثر اور پُر از معلومات مقالہ حال کی جملہ تحریروں میں نظروں سے نہیں گزرا۔ اس تحریر نے میری سوچ اور فکر پر، میرے دل پر بڑا گہرا اثر پیدا کیا ہے۔ ایسا تہ در تہ واقعات سے ترتیب پایا گیا مضمون ہے اور پھر شیعہ خاکروں والی اس میں کوئی پیوندکاری ہرگز نہیں ہے۔ میری یہ تمنّا ہے کہ اس مقالہ کو مکتبۂ جدید اور مکتبہ جدید پریس کی طرف سے طبع کروں۔ یعنی ناشر اور طابع بھی مکتبہ جدید ہو۔ کیا آپ میرے ذوق و شوق کے پیشِ نظر اس کی اجازت دیں گے؟

حضرت محترم! آپ کے لیے دعا ہوتی رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو شفائے کُلی (جسم و روح) عطا فرمائے۔ کتاب و حکمت کی تعلیم کی توفیق اپنی رحمتوں کے ساتھ جاری رکھے، آمین! آپ کی رفاقت کی تمنّا کے ساتھ۔ (رشید احمد)

۲- محترم جمیل الرّحمٰن صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'،

آپ کا گرامی نامہ اور 'میثاق'، کے شمارے مجھے مل گئے ہیں بے حد شکریہ! الحمد للہ ایک بار پھر تسلسل کے ساتھ "شہیدِ مظلوم" پڑھ لیا ہے اور یہ بات بیان کرنی ضروری ہوگئی ہے کہ پورے مقالہ کا مطالعہ بڑا ہی اثر انگیز اور قابلِ تحسین ہے۔

اس کی اشاعت کے لیے آپ نے جو اجازت عطا فرمائی ہے، اس کے لیے مجھے بےحد

خوشی ہے۔ اور اب یہ بات میرے لیے اور بھی چیلنج کا باعث بن گئی ہے کہ صاحبِ مقالہ نے جس طرح "مظلوم شہید" کی الفاظ کے ساتھ ایک دلگداز تصویر بنائی ہے اب اس کو کتاب کی صورت دینے میں جو رنگ بھرنے کا کام ہے وہ بحسن و خوبی انجام پائے اور ایک "مظلوم" اپنے محترم و معظم "مظلوم شہید" کے عزت و احترام کے حق ایمان کا اظہار پیش ہو سکے! رَبِّ یَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ وَتَمِّمْ بِالْخَیْرِ!

بطور تحدیثِ نعمت عرض ہے کہ "شہیدِ مظلوم" کے بارے میں متعدد حضرات نے تحریری و زبانی تحسین فرمائی۔ بزرگ و معمّر دانشور جناب پروفیسر یوسف سلیم صاحب چشتی نے ان الفاظ میں اس کی داد دی کہ: "میں بھی اگر اس موضوع پر لکھتا تو اس سے بہتر نہ لکھ سکتا۔"

کراچی کے جناب ڈاکٹر عبداللطیف خاں صاحب نے جو ایک علم دوست شخصیت ہیں، ان الفاظ میں اپنے تأثر کا اظہار فرمایا ہے کہ: "میں نے حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت پر بے شمار کتابیں پڑھی ہیں جو اثر پذیری اور قوتِ استدلال ڈاکٹر صاحب کے اس خطاب میں دیکھی، وہ بالکل منفرد ہے۔" وللہِ الحمد والشکر چودھری صاحب موصوف الحمدللہ اسارت سے رستگاری حاصل کر چکے ہیں۔ توقع ہے کہ جلد ہی "شہیدِ مظلومؓ" کی طباعت کا کام شروع ہو جائے گا۔ (ادارہ)

مکتوب از جناب محمد حسین صاحب آزاد لیکچرار
پائن ہلز کالج، گھوڑا گلی، مری

اخی المکرم سیادۃ الدکتور اسرار احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج شریف!

"انقلابِ نبوی کا اساسی منہاج" دو مرتبہ پڑھ چکا ہوں، قرآنی آیات کے مکرر استشہاد اور شاعرِ ملت علامہ اقبال کے سوز و گداز:

آتش از شعرِ عراقی در دلش — در نمی سازد بقرآن محفلش!
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی — کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

کے استحضار نے مقالہ کو خوب تر بنا دیا ہے۔ اور سب سے بڑی بات تو قلمکار کا خلوص اور صدقِ عمل ہے ؎

تیرا خلوصِ دلبری جان نہ ڈال دے کہیں ۔۔۔ نالہ بھی میرا مضمحل نغمہ بھی میرا بے اثر

قرآنِ پاک کی مذکورہ چار اصطلاحیں بلاشبہ انقلابِ نبوی اور تعلیماتِ قرآنی کا بنیادی اور مشترکہ مرکز و محور ہیں۔ یہ اصطلاحات اگر چار اقساط تک پھیل جاتیں تو شاید بہتر ہوتا۔ ”شہیدِ مظلوم“ اپنی جامعیت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ ”دینی جدّ و جہد اور اس کا طریقِ کار“ بہت بصیرت افروز ہے۔ فللّٰہ الحمد !

مکتوب از نابیہ عمر صدّیقی ــــ مکّہ مکرّمہ

مکرمی و محترمی جناب ڈاکٹر صاحب، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ !

دسمبر کا شمارہ مارچ میں ملا۔ اس عنایت کے لیے آپ کا اور محترم جمیل الرحمٰن صاحب کا شکر گزار ہوں۔ فوراً ہی پورا اداریہ پڑھ ڈالا، پوری تحریر نہ صرف اسلوب و انشاء کا شاہکار ہے بلکہ فکر و تجزیہ کی بھی حامل ہے۔ لوگ آپ کی خطابت کے قتیل ہیں۔ مَیں آپ کی تحریر سے لطف اندوز ہوتا ہوں، ممکن ہے اس لیے کہ میرے حصّہ میں تحریر ہی آتی ہے فوراً ہی ذہن کو تحریک ہوئی کہ اپنا تأثر لکھ ڈالوں لیکن پھر اطمینان سے لکھنے کا فیصلہ کیا۔ ادھر مولانا ..... اور مولانا ..... تشریف لے آئے ان سے بھی تذکرہ ہوا۔ مولانا ..... پرچہ لے گئے کہ دوسرے دن واپس کر دوں گا۔ سوئے اتفاق کہ پرچہ ان سے ضائع ہو گیا۔ اور اب وہ پرچہ دوبارہ میرے پاس نہیں ہے۔ سوچا تھا کہ دوبارہ آپ کو لکھنا سوئے ادب ہے، کہیں سے عاریتاً پرچہ مل جائے تو اپنے تأثرات رقم کروں۔ مگر پرچہ کسی کے پاس نہ مل سکا۔ پھر جناب جمیل الرحمٰن صاحب کا دوبارہ خط تاکیداً موصول ہوا چنانچہ ارادہ کر لیا کہ حافظہ ہی کی مدد سے کچھ تحریر کر دوں مگر ملک کی خبروں نے کئی ہفتہ تک ایسا منتشر رکھا کہ ذہن اس کام کی طرف یکسو ہی نہ ہو سکا۔ اب بڑے قصد و ارادہ سے تحوّلِ ذہن کی کچھ کوشش کی ہے اور یادداشت کے سہارے اپنا تأثر لکھتا ہوں۔

ذاتی طور پر مجھے آپ کے تجزیہ سے نہ صرف بحیثیتِ مجموعی اتفاق ہے بلکہ یک گونہ مسرّت بھی محسوس ہوئی۔ وہ اس لیے کہ مَیں نے اپنے سابقہ خط میں جو سوالات اٹھائے

تھے اور جس رُخ سے آپ سے اسلامی تحریکات کے تاریخی تسلسل پر نظر ڈالنے کا تقاضا کیا تھا۔ آپ نے اپنی تحریر میں پوری طرح اس کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ ولی اللہؒ سے اب تک کی ممتاز تحریکوں اور شخصیتوں کے کام پر آپ کا تبصرہ بلاشبہ فکر انگیز ہے۔ اگر اس ادارے کو آپ کی ان تحریروں کے ساتھ مربوط کر کے دیکھا جائے جو آپ نے کچھ عرصہ پہلے برِصغیر میں وُرودِ اسلام کے بارے میں تحریر فرمائے تھے تو برِصغیر میں تحریکِ اسلامی کے مؤرّخ کے لیے کام کرنے کا ایک انتہائی انقلابی فکری دائرۂ کار فراہم ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح برِصغیر میں قرآن و حدیث پر کئے جانے والے کام کے علمی جائزہ کی ضرورت ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی پہلے ہندوستان میں ورودِ اسلام اور اشاعت و احیائے دین کے لیے کئے جانے والے کام کا بھی ایک جامع اور مفصّل تجزیہ کرنا ضروری ہے لیکن ضروری ہے کہ تجزیہ متوازن بھی ہو اور معتدل بھی، اور اس میں ذوقیات اور ذاتی میلانات سے قطعِ نظر کرتے ہوئے پورے کام کا قرآن و سنّت کی روشنی میں معروضی جائزہ لیا جائے اور ہمارے ہاں اٹھنے والی تمام تحریکوں اور اقامتِ دین کی تمام کوششوں کو انبیائے کرامؑ کے بتائے ہوئے طریقۂ کار کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھا جائے۔ یہ کام محض تاریخی دلچسپی کے لیے نہیں بلکہ اس وقت اور مستقبل میں ہونے والی ہر اجتماعی و انفرادی کوشش کی رہنمائی کے لیے بنیادی اہمیّت و ضرورت رکھتا ہے .... "

مکتوب از جناب نجیب صدّیقی صاحب۔ سکھو

برادرم محترم جناب ڈاکٹر صاحب ! السّلام علیکم۔

جون کا پرچہ آگیا، یہ آپ نے اچھّا کیا۔ قدرے تاخیر ہی سے سہی مگر شائع تو ہو گیا۔ حقیقتِ زندگی پڑھ کر تو وجد آگیا۔

زندگی کی حقیقت عیاں ہو گئی — اشک بہنے لگے فرطِ جذبات سے
آپ نے اس طرح اسے رقم کر دیا — لوٹ آیا میں اپنے خیالات سے
اب تو نظروں میں ہے آخرت کا سماں — بہرہ ور ہوں گے اب کی ملاقات سے

(بقیہ صلا پر دیکھیں)

ادارہ

تقریظ و تنقید

نماز کامل | مرتبہ جناب مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی۔ ناشر مکتبہ اسحاقیہ، جونا مارکیٹ کراچی ع۲۔ ساتواں ایڈیشن، طباعت آفسٹ۔ کاغذ وائٹ پرنٹنگ، جیبی سائز صفحات ۲۰۸ قیمت تین روپے پچھتّر پیسے۔

مکتبہ اسحاقیہ مختصر، دیدہ زیب اور مناسب قیمت پر دینی کتب کی اشاعت کے لیے ایک مشہور ادارہ ہے۔ "نمازِ کامل" اس ادارہ کی جانب سے شائع کردہ ایک مشہور کتاب ہے۔ جو اپنی جامعیت کے لحاظ سے اس موضوع پر شائع ہونے والی بہترین کتب میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ کتابت بہت اعلیٰ اور جلی ہے۔ ہر شخص بآسانی پڑھ سکتا ہے۔ عربی عبارات میں صحیح اعراب لگانے کا بہت ہی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ نماز دین کا ستون ہے۔ لہذا نماز کی صحیح ادائیگی کا طریقہ جاننا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ طالبانِ حق کے لیے اس موضوع پر یہ کتاب پوری طرح کفایت کرتی ہے۔ کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ زیرِ مطالعہ کتاب اس کا ساتواں ایڈیشن ہے۔ جو حضرات اس امر کے متمنّی ہیں کہ وہ خود اور اُن کے اہل و عیال صحیح نماز کی ادائیگی کے طریقہ سے کماحقّہ واقف ہوں، ان کو ہم مشورہ دیں گے کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ خود بھی کریں اور اپنے گھر والوں کو بھی کرائیں۔ اِن شاء اللّٰہ العزیز اس مقصد کے لیے یہ کتاب کفایت کرے گی۔

شہادت ذُوالنّورین حضرتِ عثمانؓ | مصنّف جناب حکیم فیض عالم صاحب صدّیقی: ناشر مکتبہ تنظیم اہلِ حدیث نزد چوک دالگراں لاہور، سائز ۱۸×۲۲/۸ سفید کاغذ، کتابت و طباعت معیاری ——— صفحات ۸۸ قیمت ۵ روپے۔

اس کتاب کے مصنّف جناب مولانا فیض عالم صاحب صدّیقی ایک صاحبِ علم شخصیت ہیں۔ وہ عالمِ دین ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ کے موضوع پر گہری نگاہ

رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کے قلم سے بہت سی مفید کتابیں لکھی جا چکی اور شائع ہو چکی ہیں اور ان کتابوں نے قبولِ عام کا مقام حاصل کیا ہے۔ ایک خاص گروہ نے اُمّتِ مسلمہ کو تفرقہ میں ڈالنے کے لیے محبتِ اہلِ بیت کے نظریے کے تحت اکابر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بالخصوص خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدّیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کی ہے۔ آج بھی یہ گروہ اس کام میں پہلے سے بھی زیادہ مستعد ہے۔ اس گروہ نے اپنے سبّ و شتم کا ہدف سب سے زیادہ حضرت عثمانؓ ذوالنورین کی ذاتِ اقدس کو بنایا ہے۔ زیرِ نظر کتاب اپنے عنوان کے لحاظ سے تو شہادت ذوالنورین سے نامزد کی گئی ہے، اور اس میں زیادہ تر شہیدِ مظلوم کی شہادت کے حقیقی اسباب و حالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن پوری کتاب کے بین السطور ان غلط اور گمراہ کن باتوں کا ابطال موجود ہے جس کا سہارا لے کر ایک خاص گروہ امیر المؤمنین، امامِ عادل اور شہیدِ مظلوم حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے متعلق سوئے ظن پیدا کرنے کی مذموم حرکت کرتا ہے۔ شہادتِ عثمانؓ کے ضمن میں تاریخ کے صحیح اور حقیقی خدوخال سے واقفیت کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ان شاء اللہ انتہائی مفید ہوگا۔

کتاب کی قیمت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے، کیا ہی اچھا ہو اگر ناشر اس کتاب کو وسیع تر حلقے میں پہنچانے کے لیے اس کی قیمت پر نظرِ ثانی فرمالیں۔

عترتِ رسولؐ مصنف حکیم فیض عالم صاحب صدّیقی : ناشر مکتبۂ تنظیم اہلِ حدیث چوک دالگراں لاہور، سائز ۱۸ × ۲۳/۸ سفید کاغذ صفحات ۱۹۲ قیمت دس روپے۔

شیعیت نے عترت اور آلِ رسولؐ کو صرف اولادِ فاطمی تک محدود کر رکھا ہے اور وہ چودہ سو سال سے اس گمراہ کن نظریہ کی نشر و اشاعت میں مصروفِ عمل ہے۔ حالانکہ ہمارے علماء کا اس پر اجماع ہے کہ "عترتِ رسولؐ" سے مراد تمام قریش (جو مشرّف باسلام ہوئے) اور آلِ محمدؐ سے مراد پوری امّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں اسی مسئلہ کو احادیث شریفہ اور تاریخ و سیر کی مستند کتب کے حوالوں اور عقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو جس محنت و کاوش سے مرتّب کیا گیا ہے، وہ لائقِ تحسین ہے اور اس امر کی دلیل ہے کہ صاحبِ تصنیف کا مطالعہ کتنا

وسیع اور ان کی نظر کتنی عمیق ہے۔ اسلوبِ بیان میں کہیں کہیں تندی و تلخی جھلکتی ہے شاید یہ اس جارحانہ اقدامات اور طرزِ عمل کا ردِّ عمل ہے جو ایک گروہ کی جانب سے مختلف ابلاغ کے ذرائع سے مسلسل کیا جا رہا ہے۔ اس پروپیگنڈے کے ابطال کا اقتضا تھا کہ بات کو جہاں نقلی و عقلی دلائل سے پیش کیا جائے وہاں پیش کرنے کیلئے زوردار اسلوبِ بیان بھی اختیار کیا جائے۔

اس کتاب کا مطالعہ ہر اس شخص کے لیے انتہائی مفید ہوگا جو عترتِ رسولؐ کے مسئلہ کی حقیقت معلوم کرنے کا متمنّی ہو۔

اس کتاب کی قیمت کے متعلق بھی ہمارا وہی تاثر و احساس ہے جس کا ذکر "شہادتِ ذوالنورینؓ" کے ضمن میں کیا گیا ہے۔

عدالتِ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین

مصنّف مولانا سید لعل شاہ بخاری۔ ناشر مدنی مسجد لائق چوک، واہ کینٹ۔ سائز ۲۳×۱۸/۸، سفید کاغذ صفحات ۴۸۔ طباعت آفسیٹ، کتاب عمدہ۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔

مشہور حدیث "الصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ" کے معنی و مفہوم اور اطلاق کے بارے میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تصنیف "اسلام و ملوکیت" کی اشاعت کے بعد سے بحث و تمحیص کا آغاز ہوا تھا۔ جس پر بہت سے صاحبِ علم و قلم نے اظہارِ خیال کیا ہے اور مختلف نقطہ ہائے نظر اہلِ علم کے سامنے آئے ہیں۔ جن میں جناب مولانا محمد تقی عثمانی خلف حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اور ملک غلام علی معاونِ خصوصی مولانا مودودی صاحب کے مابین کافی علمی ردّ و قدح ہوئی ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے مصنّف نے "خلافت و ملوکیت" میں بیان کردہ تاریخی واقعات اور کتاب کے اُسلوبِ تحریر سے شدید اختلاف کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ: انصاف یہ ہے کہ "اصحابۃ کلھم عدول" کی بحث میں مودودی صاحب نے کوئی نادرست بات نہیں لکھی ہے۔ پھر انہوں نے اپنی اس رائے کا تفصیل سے محاکمہ کیا ہے۔ تبصرہ نگار کو اعتراف ہے کہ وہ گو صاحبِ تصنیف کے محاکمہ سے مطمئن نہیں ہو سکا لیکن یہ بات اپنی جگہ نہایت خوش آئند ہے کہ پوری بحث میں انتہائی سنجیدگی، متانت اور شائستگی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اس مسئلہ کی تحقیق کی جن حضرات کو جستجو ہو، ان کیلئے اس کتاب میں قیمتی مواد مل سکتا ہے۔

فہرست مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

تصانیف امام حمید الدین فراہیؒ

- مجموعہ تفاسیر فراہیؒ — ہدیہ -/۲۴ روپے
- اقسام القرآن — اردو ترجمہ الامعان فی اقسام القرآن — ہدیہ ۳/۷۵ "
- ذبیح کون ہے؟ — اردو ترجمہ القول الصحیح فی من ہو الذبیح — ہدیہ ۴/۵۰ "

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

- سلسلۂ تدبّر قرآن:
  - مبادیٔ تدبّر قرآن: تدبر قرآن کے اصول و قواعد پر اہم دستاویز — ہدیہ -/۸ روپے
  - مقدمہ تدبّر قرآن و تفاسیر آیت بسم اللہ و سورۂ فاتحہ — ہدیہ -/۳ "
  - تدبّر قرآن جلد اوّل — مشتمل بر مقدمہ و تفسیر از مبتدا تا سورۂ آل عمران — " -/۵۰ "
  - تدبّر قرآن جلد دوم — مشتمل بر تفسیر سورۂ نساء تا سورۂ اعراف — " -/۵۰ "
  - تدبّر قرآن جلد سوم — مشتمل بر تفسیر سورۂ انفال تا سورۂ بنی اسرائیل — ہدیہ -/۵۰ "
  - تدبّر قرآن جلد چہارم — مشتمل بر تفسیر سورۂ کہف یا سورۂ قصص — -/۵۰ "
- حقیقتِ دین — مشتمل بر حقیقت شرک، حقیقت توحید، حقیقت تقویٰ، حقیقت نماز — ہدیہ -/۱۶ "
- دعوت دین اور اس کا طریق کار — ہدیہ -/۱۰ "
- اقامت دین کے لئے انبیاء کرام کا طریق کار — ہدیہ ۱/۲۵ "
- قرآن اور پردہ — ہدیہ -/۱ "
- اسلامی قانون کی تدوین — " /۵ "

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے زیر اہتمام

قرآن اکیڈمی

واقع ۳۶ ۔ کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور میں

ڈاکٹر اسرار احمد کے ہر جمعرات کی شام کے **درس قرآن**

علاوہ یکم جولائی ۷۷ء سے حسب ذیل پروگراموں کا آغاز ہو گیا ہے:

۱۔ حفظ و تجوید قرآن مجید

روزانہ صبح ۷ تا ۱ —— عام عصر تا عشاء

(ناغہ جمعرات کی شام اور جمعہ کی صبح !)

۲۔ تدریس عربی — ڈاکٹر اسرار احمد

پیر ، منگل اور بدھ —— عصر تا مغرب

(عصر کی جماعت ٹھیک پانچ بجے !)

۳۔ مطالعہ حدیث — ڈاکٹر اسرار احمد

ہر پیر کو بعد نماز مغرب (ابتدا میں اربعین نووی کا درس ہوگا !)

۴۔ مطالعہ مارکسزم — ڈاکٹر الطاف جاوید

ہر منگل کو بعد نماز مغرب

۵۔ تفہیم خطبات اقبال ہر بدھ کو بعد نماز مغرب

ڈاکٹر ابصار احمد ۔ ڈائریکٹر قرآن اکیڈمی

ع صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کیلئے !

المعلن : ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

Regd. L. No. 7360

Monthly MEESAQ Lahore

Vol. 26	JULY 1977	No. 1

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

اور **قرآن اکیڈمی** کے

اغراض و مقاصد اور اس کے لئے لائحہ عمل کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے کے لئے مطالعہ فرمائیں۔

اسلام کی نشأۃ ثانیہ

کرنے کا اصل کام

تالیف :

ڈاکٹر اسرار احمد

قیمت فی نسخہ ———— ایک روپیہ

منگوانے کا پتہ :

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

٣٦-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور